فکر اقبال میں عمرانی ترقی کے نظریات

عبدالحمید کہالی*

حکمت شرقیہ کو خاص نسبت ''انا'' کے موضوع سے ہے ۔ غزالی اور رومی ، الجیلی و شبستری جس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں وہ اسی چراغ سے روشن ہے ۔ شریعت ، طریقت ، ریاضت ، سلوک ، عشق ، مقامات ، توکل ، حیرت ، فنا وغیرہ عروج انا کے مختلف مدارج ہیں جو تمام کے تمام فردی واردات سے عبارت ہیں ۔ مگر اقبال کا فلسفہ ''گلشن راز جدید'' ہے ۔ گو اس کے ہاں بھی ''من ہستم'' ہے مگر وہ ایک ایسا چھپا ہوا خزانہ ہے جس کا جوہر عمرانی ہے اور جس کے عروج و ارتقا کا راز اجتماعی عروج و خروج میں پنہاں ہے ۔ ثقافت اسلامیہ میں چھٹی صدی ہجری سے نیو کلاسیکی ادب کے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ اس دور میں المنقذ من الضلال اور مثنوی معنوی نے ایک مخصوص مزاج کی تہذیب کی جس کے مطابق شریعت و معاشرت ابتدائی شرائط و احوال ہیں ، جن کے بعد عروج کے جملہ درجے انفرادی ، باطنی اور روحانی ہیں ۔ اقبال جس راز کا انکشاف کرتے ہیں وہ یہ ہے کہ تمام تعلیم و تربیت اور سلوک و تزکیہ کا مقصود شریعت معاشرت ہے اور انا کا تمام سفر اور عروج عمرانی سیر و سلوک ہے ۔ اس وجہ سے وہ اپنے فلسفہ کے لیے نئے نام کی تلاش میں حق بجانب تھے اور کسی بہتر نام کی عدم موجودگی میں ''فلسفہ خودی'' کا نام انھوں نے پسند کیا ۔

اقبال کے ہاں بھی ''فنا'' یا بیخودی کا مقام آتا ہے مگر خود اس مقام کا بھی موضوع ان کے ہاں عمرانی یعنی ''تاسیس ملت'' ہے جب کہ ثقافت اسلامیہ کے نیو کلاسیکی ادب میں جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا بیخودی ایک ایسی منزل ہے جس میں شرائط و امتیازات سے سالک بے نیاز ہو جاتا ہے ۔ کیفیت و سرمستی کا یہ ایک روحانی مقام ہے جو بعضوں کے نزدیک آخری اور بعضوں کے نزدیک درمیانی ہے ۔ اس تقابل سے اقبال کے تصور بے خودی اور نیو کلاسیکی تصور بے خودی کا فرق نمایاں ہو جاتا ہے اور اس ضرورت کو واضح کر دیتا ہے کہ کیوں فکر اقبال کو نیا نام دیا جائے ۔

جس ثقافت کی بنیاد منطق الطیر ، مثنوی معنوی ، لمعات عراقی ، لوائح جامی ،

*عبدالحمید کہالی ، ڈپٹی ڈائرکٹر ، اقبال اکادمی ۔

عوارف المعارف ، کشف المحجوب ، مکتوبات امام ربانی اور لطائف اشرفی پر کھڑی کی گئی اس کا رخ ولایت کی طرف ہے ۔ اس کے دامن میں تمام پند و نصیحت ، دانش و حکمت اور علم‌الکتاب کا نصب العین محبوبیت اور فردیت کے تحقق میں مرکوز ہے جب کہ فلسفہ اقبال کا جیشان منصب نبوت کی طرف ہے ۔ نبوت کی غایت ''امت کی تشکیل'' یا معاشرہ کی تعمیر نو ہے ۔ اس کی حقیقت متحققہ مدینۃالفاضلہ کا قیام و انصرام ہے جب کہ ولایت کی غایت معرفت و جلوہ نمائی ہے اور اس کی منزل آخری محبوب سبحانی اور معشوق ربانی ہے ۔ وہ سب لوگ جو خلوتوں میں ، ریاضتوں میں ، مراقبوں میں ، اوراد و اذکار میں مستغرق کیے ہوئے ہیں اولیا کے پیرو ہیں اور وہ سب لوگ جو ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ‌السلام اور مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح رات دن بے خوف ہری طاقتوں سے نبرد آزما ہیں ، اور ایسے سماج کے لیے جد و جہد کر رہے ہیں جس کی بنیادیں حق میں مضبوطی سے قائم ہوں ، وہ پیروان انبیا ہیں ۔ تاریخ امت اسلامیہ میں یہ بحث وسیع پیمانہ پر چلتی رہی ہے کہ نبوت افضل ہے یا ولایت ۔ عوام کی ایک بڑی جماعت نے اس بحث کا یہ مطلب لیا کہ تکرار اس بات پر ہے کہ محبوب سبحانی افضل ہیں یا پیغمبر علیہ السلام ۔ زمانوں کے فرق کو نظرانداز کر دیا جائے تو ابن العربی اور ابن تیمیہ غرض سب ہی کا اس امر پر اجماع ہے کہ جناب سرور کائنات کو سب پر فضیلت حاصل ہے ۔ دراصل بحث طلب امر یہ تھا کہ انبیا علیہم السلام کو یہ مرتبہ فضیلت ان کی ولایت کی وجہ سے ہے یا وظیفہ نبوت کی وجہ سے ۔ ہماری ثقافت کے روحانی اجماع نے جس کے مظاہر غزالی ، رومی ، جامی ، عراقی ، سنائی ، ابن‌العربی ، الجیلی ، یحییٰ منیری ، شیخ احمد سرہندی وغیرہم ہیں اس خیال کی تائید کی کہ یہ فضیلت بوجہ ولایت ہے ۔ نبی کو اتنے مراتب ولایت کے حاصل ہوتے ہیں کہ غیر نبی کی رسائی وہاں تک ناممکن ہے ۔ پس اس بنا پر صاحب نبوت ولی بہر صورت دوسرے اولیاء مقربین سے افضل ہے ۔ یہاں مقصد اس بحث کی تفصیل میں جانا نہیں بلکہ اس امر کو تاکیداً واضح کرنا ہے کہ ثقافت اسلامیہ کی اصل میل دانش میں جس ملی مزاج اور روح نے پرورش پائی اس کے نزدیک ولایت کو نبوت پر فضیلت تامہ حاصل ہے ، جس کا مطلب اقدار کی صورت میں یہ ہے کہ خلوت کو جلوت پر ، خانقاہ کو مجلس پر ، اوراد کو معاملات پر ، ریاضت کو جہاد پر ، تزکیہ نفس کو تقاضہ عمرانی پر فوقیت حاصل ہے ۔ بیسویں صدی میں اقبال کا فلسفہ ایک نئی کروٹ ہے ۔ ہمارے عہد کے اس حکیم کے افکار میں ایک واضح رست خیزی کا تجربہ ہوتا ہے کہ نبوت ، منصب نبوت اور اتباع نبوت کو بذات خود ، بوجہ خود اور بمقام خود ،

تمام ولایت اور اس کے مدرۃالمنتہا پر فضیلت حاصل ہے ۔ اور اس اعتبار سے یہ طرز فکر ثقافت اسلامیہ کی روح میں بنیادی انقلاب کی پہلی واضح اور روشن ترین قوس قزح ہے ۔ ولی ، نبض کائنات کے زیر و بم کو اپنے نفس میں محسوس کرتا ہے اور نبی حقیقتِ وجود کو اس حبل‌اللہ میں دیکھتا ہے جس کو سب مل کر تھام لیں ۔ واضح رہے و اعتصمو بحبل‌اللہ ایک سماجی علامت ہے ۔ چنانچہ نبی اور ولی کا یہ فرق ہے کہ نبی کوہ فاران سے اتر کر سوئے قوم آتا ہے ، یہی اس کی بیخودی ہے ۔ اور ولی کی بیخودی نعرۂ الحق ہے ، وہ شہر سے ویرانہ کی طرف جاتا ہے ۔ نبوت اور اتباع نبوت میں ابراہیم اور نمرود ، موسیٰ اور فرعون کا مقابلہ ہے اور ولایت میں فقط اللہ اللہ ۔ اپنے پانچویں خطبہ میں خود اقبال نے نبی اور ولی کے فرق پر یوں اظہار خیال کیا ہے :

''مرد عربی بر فلک الافلاک رفت و باز آمد ۔ واللہ اگر من رفتمی ہرگز باز نیامدمے'' مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی کے یہ الفاظ ہیں جن کی نظیر تصوف کے سارے ذخیرہ ادب میں مشکل ہی سے ملے گی ۔ شیخ موصوف کے اس ایک جملے سے ہم اس فرق کا ادراک نہایت خوبی سے کر لیتے ہیں جو شعور ولایت اور شعور نبوت میں پایا جاتا ہے ۔ واردات اتحاد میں جو لذت اور سکون حاصل ہوتا ہے ، صوفی نہیں چاہتا اسے چھوڑ کر واپس آ جائے ۔ لیکن اگر آئے بھی جیسا کہ وہ ضرور آتا ہے تو اس سے بنی نوع انسان کے لئے کوئی خاص نتیجہ مترتب نہیں ہوتا ۔ برعکس اس کے نبی کی باز آمد تخلیقی ہوتی ہے ۔ وہ ان واردات سے واپس آتا ہے تو اس لیے کہ زمانے کی رو میں داخل ہو جائے اور پھر ان قوتوں کے غلبہ و تصرف سے جو عالم تاریخ کے صورت گر ہیں ، مقاصد کی ایک نئی دنیا پیدا کرے''[۱]۔

مقاصد کی نئی دنیا کی آفرینش اور ان کے جلو میں نئی تاریخی قوتوں کا اجراء ، معاشرہ انسانی کی تشکیل نو ، مجلسی دائروں کی باز استواری اور انسانیت کے لیے نئے نئے امکانات کی عقدہ کشائی یہی نبوت اور بعد از نبوت اتباع نبوت و سنت ہے ۔ اقبال کا فلسفہ اپنے محرکات ، ادراکات اور تصورات میں اسی جادہ نبوت پر فکر اور تعقل کی تعمیری کوشش ہے ۔ اسی بنا پر سوچنے کے وہ انداز ، ابلاغ کے وہ طریقے ، رموز و علامات کے وہ برتاوے اقبال کے ہاں نہیں ملتے جو ہماری ولایت مدار ثقافت سے مخصوص ہیں اور اس کے اسباب زیب و زینت ہیں ۔ مثلاً عالم امثال

۱۔ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ مترجم نذیر نیازی (لاہور ۱۹۵۸) صفحہ ۱۸۸-۱۸۹ (کسی قدر لسانی تبدیلی کے ساتھ) ۔

و لاہوت ، طوطی و آئینہ ، جلوہ طور و از ہوش رفتن وغیرہ وغیرہ ۔

نبوت مدار تمدن کی ہر پرت عمیق عمرانی واقعہ ہے ۔ یہاں سجدہ ملائک سے لے کر ہبوط آدم ، دنیا و عقبیٰ ، حشر و نشر وغیرہ تمام امور اجتماعی اور مجلسی تجربات ہیں ۔ اس لیے ولایت تمام مدنیت کے آلات و ظروف ، مشکوۃ و فانوس ، استعارے اور علامتیں اس میں ساقط الاعتبار ہو جاتے ہیں ۔ اقبال کے کلام و افکار میں تو یہ تو ادراکات و تخیلات و استعارات کی ایک دنیا ہے جو ولایت سے نبوت کی طرف انقلاب مدار پر دال ہے ۔ انقلاب کا یہ عمل اقبال میں مکمل ہوا یا نہیں یہ ایک علیحدہ مسئلہ ہے جس پر پھر کبھی غور کیا جائے گا ۔ یہاں جو نکتہ قابل غور ہے ، وہ یہ ہے کہ نبوت مدار تمدن کی لغات ، علامات ، اور تشبیہات اس لیے مختلف ہوتی ہیں کہ اس کی اپنی اخلاقیات ہوتی ہے ، جس کو ولایت مدار معاشرت سے کوئی مناسبت نہیں ہوتی ۔ یہی اخلاقیات اقبال کے عمرانی افکار کی اساس فراہم کرتی ہے ۔ چنانچہ رفتہ رفتہ وہی اقدار ان کے وجودیاتی خیالات کی رکن رکین بنتی ہیں جن کا منبع شعور نبوی ہے ۔ ان ہی اقدار سے ان کے تصور خودی کی تکمیل ہوتی ہے ۔

نبوت مدار تمدن کا مایۂ خمیر حیاتی تجربہ ہے ۔ ہماری حیات دراصل نیت و ارادہ اور عمل و حرکت کا استمرار پیہم ہے ۔ چنانچہ شعور نبوت اسی حقیقت پر تمدن کی تاسیس کرتا ہے ۔ ولایت مدار تمدن میں حقیقت انسانی ''علم'' کو سمجھا جاتا ہے ۔

آدمی دید ست باقی پوست است دید آن باشد کہ دید دوست است

شعور نبوی کا تکوینی وجدان ''لیس الانسان الاماسعیٰ'' ہے ۔ یہ وجدان نیت ، ارادہ اور جہد کا حضوری تجربہ ہے جس سے شخصیت ، کردار ، زاویہ نگاہ ، دنیا اور کائنات سے تعلق کی تعمیر ہوتی ہے ۔

نیت و ارادہ فاعلانہ کوائف ہیں جو ''حالت علمی'' اور کیفیت شہود سے مختلف ہیں ۔ مؤخرالذکر تجربات ولایت مدار رویہ حیات کی اصل الاصل ہیں ۔ جادہ علم کی برآرزان قدر توجہ و انجذاب ہے ۔ اس کا سنگھاسن وادی حیرت میں ہے ۔ اس کا چتر چشم حیراں ہے ۔ پھر یہ خالصتاً نجی تجربہ ہے ۔ ہر ایک صرف یکہ و تنہا جلوہ گاہ کے سروپ میں ڈوبتا ہے اور ابھرتا ہے ۔ چنانچہ کیفیت علم کو ماسوا سے گریز ہے ۔ اس کی نہایت پولاد پائمال کی طرح وجود منفعل ہے ۔ محویت علم میں ارادہ کا معمولی سا خطرہ بھی کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے ۔ چنانچہ اس تمدن میں نفی ارادہ ، انفعالیت ، ترک بلکہ ترک ترک تشکیلی اخلاقیات ہیں ۔ نبوت مدار

کردار کے لیے بھی اخلاقیات زہر ناب ہے ۔ جس حیات و شعور کی پرورش اس کی آغوش میں ہوتی ہے وہ کائنات کا ایک گزرتا ہوا لمحہ تو بن سکتی ہے مگر تقدیر کائنات اور وقت کی شیرازہ بند نہیں بن سکتی ۔

نبوت مدار تمدن زندگی کے بارے میں ایک انقلابی رویہ ہے جو اثبات ارادہ اور اس کے نظم و نسق پر حیات انسانی کو استوار کرتا ہے ۔ ارادہ اور اس کے تغیر آفرین کوائف حیاتی تجربات ہیں ۔ ان تجربات کا تحفظ ، ان کا ارتقا و استحکام ، ان کا عروج و تصفیہ ، اس تمدن کے عناصر ترکیبی ہیں ۔اس تمدن کے تقویمی نقطہ نظر کے مطابق چونکہ زندگی کی اکائی ''ارادہ'' اور نیت ہے اس لیے زندہ وہی ہے جو صاحب ارادہ یعنی مرید ہو ، اور اللہ سے بڑھ کر کون مرید ہے ۔ پس اللہ کے اخلاق پر اٹھایا جانا اس تمدن کا نصب العین ہے ۔ چنانچہ اس کے جانفزا ماحول میں جو شخصیت پرورش پاتی ہے اس کا جوہر استقلال ، ارادہ ، فعالیت ، اختیار اور اختیار اختیار ہوتا ہے ۔ اسی شخصیت کو اقبال نے خودی سے تعبیر کیا ہے ۔ اس کا شعور ذات ارادہ کا شعور ہے ۔ اس فلسفہ حیات میں انسان فاعلانہ قوت ہے جو فطرت نہیں فاطر ہے ۔ اس کے وجودی احوال کیفیت علم کی طرح منفعل نہیں ۔ وہ ارادہ جس میں بے اختیاری کا غلبہ ہو اور جو ایسا معلوم ہو کہ خود بخود طاری ہو رہا ہے ، دراصل وہ ارادہ ہی نہیں بلکہ کیفیت علم کی کوئی قسم ہے اور اس کا حامل ہرگز مرید یعنی صاحب ارادہ نہیں ۔ اسی وجہ سے ہوش رفتن سب سے بڑی منفی قدر یا شر ہے جس سے یہ پورا تمدن بتاشے کی طرح بیٹھ سکتا ہے ۔ حفظ ہوش و تمکنت ، اس تمدن کی ناموس اکبر ہے ۔ ارادہ اور نیت وہی ہے جو خود اختیاری سے عبارت ہو ۔ چنانچہ خود اختیاری کا استحکام اس تمدن کی ہیئت قائمہ ہے ۔

اقبال اسرار و رموز میں دین اسلام کے نظام ہائے عبادات کا تذکرہ کرتے ہیں اور واضح کرتے ہیں کہ وہ کس طرح استحکام خودی کی صورت گری کرتے ہیں ۔ کمزور ارادہ جلد ہی مرجھا جاتا ہے یا ذرا سے دباؤ سے ٹوٹ جاتا ہے ۔ اسلام کا نظام عبادات ارادہ کو صیقل کرتا ہے اور اس میں زندگی کی رو قایم رکھتا ہے ۔ ارادہ حیات ہے اور حیات ہی کی طرح زندگی کی منزلیں طے کرتا ہے ۔ چنانچہ جس طرح ابتدا میں ہر نو مولود کی زندگی کا انحصار ایک دوسری ہستی پر ہوتا ہے اور وہی اس کی زندگی کے اوقات کو متعین کرتی ہے ، تب کہیں جا کر یہ نو مولود اپنے آپ چلنے پھرنے کے قابل ہوتا ہے ۔ یہی حال ارادیت کا ہے ۔ اس کی ابتدائی تربیت اختیار غیر کی مرہون منت ہوتی ہے ۔ ہر آدمی ابتداءً یہ محسوس کرتا ہے کہ صوم و صلواۃ کا نظام ایک خارجی نظام ہے ۔ اس نظام کی طاعت گویا اپنے اختیار کو غیر کے اختیار میں دے دینا ہے ۔ مگر اسی سے

خود اختیاری کا تناور درخت دیگر اختیاری سے تغذیہ حاصل کرکے پروان چڑھتا ہے - اسلام کا نظام عبادت انسانی ارادے کو نظم و ضبط کا پابند بنا کر مستحکم صورت عطا کرتا ہے - اس کی مثال یوں ہے کہ خارجی دباؤ کی کمی ایک شئے کو کوئلے میں تبدیل کرتی ہے جبکہ اسی دباؤ کی زیادتی اسی شئے کو ہیرے میں تبدیل کر دیتی ہے - ارادہ صوم و صلواۃ کی پابندی کرکے اپنی آزمائش بھی کرتا ہے اور تربیت بھی - نیز اپنا رزق بھی اسی سے پاتا ہے -

حالتِ سکر نماز کو باطل کر دیتی ہے - نیند خود وضو کو توڑ دیتی ہے - اسلامی فلسفۂ انسانیت میں یہ امور جہاں شرعی ہیں، وہاں رمز و کنایہ بھی لیے ہوئے ہیں - نیند اور سکر دونوں سے ارادے میں رخنہ اندازی ہوتی ہے اور ہوش و خرد کا سقوط ہو جاتا ہے - چنانچہ ان دونوں حادثات سے اسلام کے حکم شرعی کے مطابق عابد دائرۂ صلواۃ سے خارج ہو جاتا ہے - واردات سکر کے سلسلے میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ بعض اہل صلواۃ یہ کہتے سنے گئے ہیں کہ انھیں نماز میں بڑی لذت ملتی ہے اور یہ روحانی لذت انھیں اوقات صلواۃ کے لئے بیقرار رکھتی ہے - در اصل اس قسم کی وارداتِ لذت بھی سکر کی قبیل سے ہیں - وہ لوگ جو صلواۃ اس لئے پڑھتے ہیں کہ اس میں لذت ہے، سو یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے ابھی تک صلواۃ کی بو تک نہیں سونگھی - وہی لوگ فائز اور مرام ہیں جو نماز اس لئے پڑھتے ہیں کہ یہ جناب رب العزت کی خدمت میں حاضری ہے اور ان قاعدوں کے مطابق حاضری ہے جو اس نے مقرر کئے ہیں - پھر وہ لوگ ہیں جو صلواۃ اس لئے پڑھتے ہیں کہ انھیں اس کی پابندی کی عادت ہو گئی ہے - عادت بھی انحطاطِ ارادہ ہے اور مبینہ طور پر حالتِ سکر میں ہیں - یہ نمازی ان سے بہتر نہیں ہیں - غرض صوم و صلواۃ کے پابند بہت سے ملیں گے مگر عبادت سچی اور اصلی صرف اُن کی ہو گی جو اس میں نہ کسی لذت کے متلاشی ہوں، نہ کسی وقت گزاری کے، نہ اس پر اس لئے مجبور ہوں کہ عادت ہے، نہ اس لئے کہ زمانہ خراب ہے، خدا کو خوش کر لیں گے تو وہ ہماری مدد کرے گا - یہی وہ لوگ ہیں جن کی عبادت میں نور ہے، پورے ہوش و گوش کے ساتھ حاضری دینے والے ہیں اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے ارادے کو فولاد کا سا استحکام حاصل ہو جاتا ہے -

اسلام کا نظام عبادات اجتماعی ہے - صوم و صلواۃ، حج وغیرہ یہ سب کے سب گروہی اور اجتماعی بندوبست ہیں - یہ امر بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ استحکامِ خودی کوئی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی واقعہ ہے - خودی کی اجتماعی

ساخت اسلام کا نظریہ' حیات ہے اور فلسفہ' خودی کا سنگ بنیاد ہے ۔ اسلام نے اپنے نظریہ' انسانیت کو ایک پاکیزہ حکایت سے واضح کیا ہے ۔ تمام بنی آدم کی ارواح کو جمع کیا گیا اور ان سے اس حقیقی پوچھنے والے نے پوچھا ''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟'' ان سب نے اقرا کیا ''بے شک''[1] ۔ یہ حکایت میثاق الست ہے ۔ انسانوں نے جماعت کی شکل میں یہ میثاق کیا تھا اس لئے اس کی تعمیل بھی اجتماعی معاملہ ہے ، انفرادی نہیں ۔ اس میثاق کا مطلب ہماری موجودہ معاشرت اور اس کے نظام انصرام کو زیر و زبر کرنے والا ہے ۔ بے شمار اشیا اور حاجت روا انسان کو پکار پکار کر بلاتے ہیں کہ ہم تمہارے رب ہیں مگر میثاق الست کے مطابق حق تعالیٰ ہی انسانوں کی پرورش کرنے والا ، ان کا رازق ، ساوی اور ملجیٰ ، حاجت روا اور ناخدا ہے ۔ پس اس میثاق سے تمام انسان تمام مدعیان ربوبیت سے بری ہو گئے ۔ میثاق الست انسانوں کے لئے پروانہ' حریت ہے ۔

ولایت مدار تمدن میں یہ میثاق الست محض ایک ہالہ' علم بن جاتا ہے ۔ اس تمدن کا ذہنی رویہ ''وحدت الوجود'' ہے جو انسان سے اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ اس کیفیت تک پہنچے کہ اسے ہر رازق کے پیچھے خدا رازق محسوس ہو ، ہر حاجت روا کے پیچھے خدا حاجت روا معلوم ہو مگر یہ ایک شہودی کیفیت ہے جو وجود اور زندگی میں' ہستی اور کائنات میں کسی انقلاب کا باعث نہیں ہوتی۔ دنیا تو اپنی اصلی حالت پر' جیسی کہ وہ ہے' قایم رہتی ہے' صرف سالک کے محسوسات میں تبدیلی آ جاتی ہے ۔ یہ تبدیلی اس قسم کی ہوتی ہے کہ ہر بات میں ، ہر حادثے میں ، ہر ذرے میں ، ہر روا نا روا تغیر میں سالک کو خدا اور اس کا ہاتھ مشہود ہوتا ہے ۔

وہ تمدن جس کی بنیاد یہ ہو کہ وہ علمی کوائف کے تبدل و تغیر کو دنیا و آخرت سمجھے' اس مشاہدے کو یقیناً معراج قرار دے گا اور اس کی شہادت دینے والوں کو ابدال و ابرار و اقطاب قرار دے گا ۔ مگر لبوت مدار تمدن کوائف علمی کے فریب میں نہیں آ سکتا ۔ اس کی نشاۃ و نسیج ان کوائف وجود یا امور واقعی سے ہوتی ہے جن سے دنیائے حادثات کی تشکیل ہوتی ہے ۔ سب سے بڑا سر جو میثاق الست میں پوشیدہ ہے' یہ ہے کہ سب انسانوں نے اقرار کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ ہی ان کا رب ہے ۔ اب اگر دنیا کی حالت یہ ہو کہ سچ مچ چند لوگ انسانوں کے رب بن گئے ہوں' ان کے ہاتھ میں پرورش اور رزق کے سامان آ گئے ہوں اور پھر حاجت روائی کے لئے لوگ ان کی طرف رجوع ہونے پر مجبور ہوں

۱ - قران مجید ، ۷ ، ۱۷۲ -

تو جاننا چاہیے کہ انسان میثاق الست سے پھر گئے اور دنیا میں فرمانِ کفر جاری ہو گیا - پس جہاد فرض ہو گیا -

ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

اس جہاد کا منشا تازگی حیات ہے اور اس کا واضح نصب العین یہ ہے کہ کوئی فرد دوسروں سے یہ نہ کہہ سکے ''انا ربکم الاعلیٰ'' - سب انسانوں کا رب وہی ہو عملاً اور واقعتاً جس کی ربوبیت کا سب نے اقرار کیا تھا اس طرح ربوبیت الٰہی کوئی عقیدہ اور خیال کا معاملہ نہیں بلکہ حقیقی دنیا کا معاملہ ہے ، وہ دنیا جس کی تعمیر حادثات پیہم اور موج در موج ہنگاموں سے ہوتی ہے - یہ ایک عمرانی اور سماجی مظہر ہے' ایک ایسے نظام کی مسلسل تقویم ہے جس میں کسی فرد یا افراد کی ایک دوسرے پر اجارہ داری کا خاتمہ ہو ، وسائل ربوبیت پر کسی کی بالا دستی نہ ہو اور پرورش کے لئے لوگ اپنے میں سے چند کے محتاج نہ ہوں ، تاکہ تمام حالات اللہ تعالیٰ کی شہادت دیں کہ وہ ہی سب انسانوں کا پرورش کرنے والا اور پالنے والا ہے - یہ ایک عملی انقلاب ہے جس کا بدل ولایت مدار حضرات خانقاہ میں تلاش کرتے ہیں اور محض خیالی وحدت الوجود کی واردات تک پہنچ کر فنا ہو جاتے ہیں - یہ حضرات اہل علم ہیں - اقبال کہہ گئے ہیں :

لا کھ حکیم سر بجیب ایک کلیم سر بکف

وہ کہتے ہیں : ''خودی کی زندگی اطناب کی ایک حالت ہے . . . میں (یعنی خودی) شئے نہیں ، عمل ہوں . . . اعمال و افعال کا وہ سلسلہ جس میں ہر عمل دوسرے پر دلالت کرتا ہے اور جو ایک دوسرے سے وابستہ ہیں تو اس لیے کہ ان میں کوئی رہنما مقصد کام کر رہا ہے''[1] - نظام زندگی کی وہ تاسیس جس میں کوئی انسان دوسرے کا رب نہ ہو ، ایسی زندگی کا طلب گار ہے جس میں انسانی خودی ہر لمحہ چاق و چوبند ہو اور ناروا سے ہمیشہ ٹکراتی رہے - اسی ٹکراؤ پر حیات انسانی کے امکانات کا مدار ہے - مضبوط ارادہ اور عمل کی بے پناہ قوتیں انسانوں کو انسانوں سے مغلوب و مقہور ہونے سے بچاتی ہیں اور اس نظام کو جاری و ساری رکھتی ہیں جس میں میثاق الست کی تکمیل ہوتی رہتی ہے - اسی لئے زندگی مسلسل جہاد ہے اور سعی ناتمام ہے ورنہ تباہی ہے - قرآن حکیم (۱۰۳ ، ۲-۳) نے بیان کیا ہے : ''ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنو و عملو الصالحات'' (یقیناً انسان گھاٹے میں ہے ، سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور جنھوں نے صالح عمل کیا)

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، مترجمہ نذیر نیازی ، ۱۵۶-۱۵۳

ایمان اور اعمال صالحہ وہی ہیں جن کا زندہ رشتہ میثاق الست سے قائم ہو۔ جو حقیقت میثاق الست میں پوشیدہ ہے ، وہی کلمہ طیبہ کی مصداق ہے : لا الہ الا اللہ۔

جس ایمان یا نیک عمل کا رشتہ حکایت میثاق یا کلمۂ طیبہ سے باقی نہیں رہتا وہ خزاں رسیدہ پتوں کی طرح شجرِ حیات سے کٹ جاتا ہے اور اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا ۔ وہ چٹان پر ریت کی طرح ہوتا ہے ۔ زور کا مینہ برستا ہے اور پھر بنجر چٹان رہ جاتی ہے[1] ۔

بہاری صوم و صلوٰۃ ، صنعت و زراعت ، سیاست و حکومت ، رسل و رسائل ، آمد و خرچ وغیرہ وغیرہ ایک عضویاتی 'کلّیت' میں مفہوم آرا ہوتے ہیں ۔ اسی کلیت کو ہم نظام اجتماعی کہتے ہیں اور یہ نظم اپنے افراد کے ساتھ ایک جماعت ''ملت'' یا معاشرہ کہلاتا ہے ۔

اقبال نے اس مسئلے پر بہت تفصیلی بحث کی ہے کہ معاشرہ یا جماعت کوئی مجردات عقلیہ کی قبیل سے نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جو اپنے افراد کے مجموعے سے زائد ہوتی ہے ۔ وہ زائد امر کیا ہے؟ حیات ہے ، رہنا توانائی ہے ۔ جو ہر ہر فرد میں کام کرتی ہے اور اس طرح سے اس کلیت کے ہر ہر پہلو ، جزو اور عمل میں جاری اور ساری ہوتی ہے ۔ یہی رہنا توانائی اس کی میزان ہے ، اس کی قدرالاقدار ہے ۔ ملت بیضا کی رہنا توانائی کلمۂ طیبہ یا میثاق الست ہے ، اس سے باہر ہماری عبادات ، ہماری سیاست ، ہماری صنعتی و معاشی جد و جہد ، تعلیم و تربیت کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتیں ۔ اس سے ہٹ کر وہ ایک دوسرے کی کمزوری کا باعث ہو جاتی ہیں اور ایسی ناہمواریاں پیدا کرتی ہیں جو شرفِ انسانیت پر دھبا ہیں ۔ ان کی مثال ایسی ہے کہ لوگوں نے باغ لگایا ، جو دیکھنے میں بڑا خوشنما ہو ، پھر انھوں نے سوچا کہ صبح آ کر اس کے پھل جمع کریں گے ، پھر وہ سو گئے اور راتوں رات آندھی چلی اور سارا باغ اُجڑ گیا[2] ۔ یا پھر ان کی مثال وہی ہے جو اوپر بیان ہوئی کہ ان کے سارے کام بس چٹان پر بکھری ہوئی ریت کی طرح ہو جاتے ہیں جسے بارش بہا لے جاتی ہے ۔ سو جب اعمال میں عضویاتی کلیت باقی نہیں رہتی اور رہنا توانائی سے کٹ جاتے ہیں تو پھر کوئی بھی عمل زندہ یا صالح نہیں رہتا ۔ عبادات رسومات بن جاتی ہیں ، صنعت و حرفت قہر و جبر میں تبدیل ہو جاتے ہیں ۔ سیاست کاری

۱۔ تمثیل ، ماخوذ از قرآن مجید ۲ ، ۲۶۴ ۔
۱۔ تمثیل ، ماخوذ از قرآن مجید ۶۸ ، ۱۳-۱۷ ۔

چھوٹے چھوٹے خداؤں کا استھان اور مجلسی زندگی ان چھوٹے خداؤں کی کھوٹی حمد و ثنا کا شوالہ بن جاتی ہے ۔ پھر تمام ملی فائدے اور متاعِ قومی چند ہاتھوں میں سمٹ آتے ہیں ، وہی اجارہ دار مذہب سازی اور آئین سازی کرتے ہیں اور اس طرح ظلم و ستم کے جھگڑ چلتے رہتے ہیں ۔

زندگی سے فرار سکھانے والے مذاہب کی تعلیم یہ ہے کہ مظلومیت بڑی نیکی کی چیز ہے ، ظلم پر چپ رہنے والے کے لیے آخرت کی زندگی ہے ۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو یہاں اندھا ہے وہاں بھی اندھا ہوگا[1] ۔ اقبال کہتے ہیں کہ حیات بعد ممات کوئی از خود ملنے والی نعمت نہیں ۔ یہ جد و جہد اور فضل الٰہی کا ثمرہ ہے ۔ یہ نظریہ اس خیال خام کی تردید کرتا ہے کہ جناب خداوندی میں مار کھانے والے ، سر جھکانے والے ، کمزور روحوں کے مالک کسی خاطر مدارات کے مستحق ہوں گے ۔ اگر آپ دیکھیں تو یہ وہ لوگ ہیں جو خوف و ڈر میں مبتلا ہوئے اور اگر آپ اور گہرا جائیں تو معلوم ہو کہ کلمۂ طیبہ پر ان کا ایمان حلق سے نیچے نہیں اترا تھا ۔ حکایت الست کے باوجود ڈھور ڈنگروں کی طرح سواریوں کا کام دیتے تھے اور چپ چاپ خود ساختہ خداؤں کے لیے سامان دنیا فراہم کرتے تھے ۔ موت اور حیات دونوں زندگی کی نعمتوں میں سے ہیں مگر یہ وہ لوگ ہیں جنھیں موت تھی نہ زندگی ۔ قرآن حکیم میں حالات بعد از وفات کے سلسلے میں ایسے لوگوں کا بیان ہے اور ایسی جہنم کا بیان ہے جہاں نہ موت ہوگی نہ حیات[2] ۔ حیات بعد ممات کا تعلق سخت کوشی اور جہد مسلسل سے ہے ۔ جو یہاں کارزارِ حیات میں زندگی کی بازی لے گئے وہ وہاں بھی لے جائیں گے اور فنا پر غلبہ پائیں گے ، ان کے لیے ہی آخرت کے انعام ہوں گے ۔

ان عمومی فلسفیانہ خیالات کی روشنی میں اقبال نے اپنے تفکر عمرانی کو زمانۂ حاضرہ کے مسائل پر مرکوز کیا ۔ تدریجی طور پر ان کے نتائج تمام ایسے تمدنوں سے متناقض ہیں جن میں ''ارادیت'' کو حیاتی اور وجودیاتی قدر برترین کا رتبہ حاصل نہیں ۔ بالخصوص وہ جدید مغربی تمدن کو انسانیت کے لیے سب سے بڑی تباہی کا باعث سمجھتے تھے ۔ اس کی دونوں طرحوں اور شاخوں ، سرمایہ داری نظام اور اشتراکیت ، میں وہ انسانی خودی کا حال اور مستقبل تیرہ و تار محسوس کرتے تھے کہ ان کی نسیج میں افراد انسانی معدودے چند آدمیوں کے ضمیمے یا لاحقے بن

۱- قرآن مجید ، ۱۷ : ۷۲ ۔
۲- قرآن مجید ۸۷ ، ۱۲-۱۳ ؛ ۲۰ ، ۷۴ ۔

جاتے ہیں ۔ اقبال کا فلسفہ سرِّ فراق ہے ۔ وہ اتصال و اتحاد میں وجود اور ہستی کی نفی پر استدلال کرتے ہیں ۔ فراق ، تمیز ، امتیاز و فرقان میں استحکام ہستی محسوس کرتے ہیں ۔ یورپ کا مشینی نظام ، سرمایہ داری کے واسطے سے ، افراد کی خودی کو کمزور کرکے ان کی انفرادیت مٹا دیتا ہے اور وہ دراصل چند آدمیوں کی حکمت عملی کے غلام بن جاتے ہیں ۔ نظام اشتراکی جس کو اقبال مزدکیت نو سے تعبیر کرتے ہیں ، انسانوں کو ایک غیر ممیز کل میں ڈھال دیتا ہے جس کے اندر کوئی حیات پرور و حیات آفرین قدر باقی نہیں رہ سکتی ۔ اس لیے وہ انسانیت کا مستقبل اور اس کی ترقی کے روشن امکانات اسلام کے نظام میں دیکھتے ہیں اور اسی لیے انھوں نے اپنی ساری کوششوں کا مطمح نظر یہ بنایا کہ اسلام کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ کیا جائے کہ اسی میں ناموس حیات پائی جاتی ہے ۔ چنانچہ وہ ہرگز اس بات پر آمادہ نہ تھے کہ اس عظیم تاریخی قوت کو وقتی مصالح کی خاطر قربان کر دیا جائے ۔ اس سے تمام عالم انسانیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا ۔ اسلام کا طبعی میلان واسطوں اور توسل کی نفی کی طرف ہے ۔ خدا اور بندے کے درمیان کوئی واسطہ نہیں اس لیے اس کے دامن میں کوئی طاغوتی نظام نہیں پنپ سکتا ۔ مگر شرط یہی ہے کہ اسلام کے اس نظام کو رو بہ کار لایا جائے ۔ طاغوت قرآن شریف کی لغت میں سے ایک لفظ ہے ۔ جلال‌الدین سیوطی نے ''اتقان‌القرآن'' میں لکھا ہے کہ یہ حبشہ کی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں پروہت ۔ چناں چہ طاغوتی نظام سے مراد ایسا نظام ہے جس میں لامائیت پائی جائے جو سماج میں فرمان دہی کے اہرام قائم کرے اور جس میں احکامات اوپر سے صادر ہوں اور عوام کا کام بس ان کی اطاعت ہو ۔ یہ ایسا نظام ہے جس میں طاغوت اعظم اس امر کا دعویدار ہوتا ہے کہ روح کائنات سے اس کا اتصال قائم ہے یا یہ کہ عقل کل اس کی ذات میں آ گئی ہے یا یہ کہ پوری روح ملت اس میں حلول کر گئی ہے ۔ پھر وہ قوم کو آئین دیتا ہے ، اس توقع کے ساتھ کہ کوئی اس آئین پر چون وچرا نہیں کر سکتا ۔ اور پھر وہ اپنے پروہتوں کے درمیانی سلسلے قائم کرتا ہے یہاں تک کہ ہر چھوٹی چھوٹی آبادی یا آبادی کے حلقوں میں ایک مقامی پروہت یا پیشوا ہوتا ہے جو قوم کو اس کے معاملات میں اپنے حکم اور احکام بالا کے مطابق چلاتا ہے ۔ یہ واسطہ در واسطہ نظام ہے ۔ اسلام میں ایسے کسی نظام کی گنجائش نہیں ۔ یہ سرِّ ختم نبوت ہے جس پر اقبال نے بہت زور دیا ہے ۔ اس سرِّ کا مفہوم یہ ہے کہ ہر وہ شخص جو اس بات کا مدعی ہو کہ وہ آئین ساز ہے اور اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس امت پر خود ساختہ آئین کا نفاذ کرے ، انسان کاذب اور امام باطل ہے ۔ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اب

اس امت میں کوئی شخص نہیں ہوگا جو وحی من جانب اللہ یا کسی اور قسم کے حق و امتیاز یا قوت و استیلا کی بنا پر یہ دعوی کر سکے کہ وہ آئین دینے والا ہے اور جو اس کے دیے ہوئے آئین پر چلنے سے انکار کر دے مستحق سزا ہے ۔ در اصل امت محمدیہ میں بذریعہ اجماع اپنا آئین خود بنانے ، اپنے اداروں میں تبدیلی کرنے ، اور نئے جماعتی قالب اختیار کرنے کا حق ودیعت کیا گیا ہے ۔ جس نے اس حق کی پاسداری کی وہ فلاح کے راستہ پر چلا اور جس نے اس کی حفاظت نہیں کی وہ خسارے میں رہا اور جس نے اس کو غصب کیا وہ فرعون اور ہامان کے زمرے میں شمار ہوا ۔

احکام عمرانی کی نئی تدوین ، واجبات اور محرمات کا تعین نو ، فرائض و حقوق کا حیات پرور نظام عقلی استدلال و استخراج کے ذریعہ وجود میں نہیں آ سکتا ۔ جو عقل اس کے لیے درکار ہے وہ ایسی عقل ہے جو اپنے جوہر میں خود نقش حیات ہو اور حیات ہر وقت متحرک ، متغیر اور فعال ہے ، اس کی فطرت میں بالیدگی ہے ، وہ تا دیر یکساں حالت پر قائم نہیں رہ سکتی ۔ وہ عقل جو حیات کی اس ماہیت کا ساتھ دے سکتی ہے عقل تجرباتی ہے جو تغیر پر کمند پھینکتی ہے اور اس کو انسانی ضابطہ میں لاتی ہے ۔ اور یہ عمل مسلسل ہے ۔ اسلام کی بھی یہی ماہیت ہے ۔ اقبال فرماتے ہیں کہ ''اسلام ایک سماجی تجربہ ہے''[1] ۔ اور یہ کام عقل تجرباتی کا ہے ۔ نہ کہ عقل مجرد کا ، کہ اس تجربے کو آگے بڑھائے ۔ یہ عقل زندہ اور فعال حیات کا حرکی اور تدبیری پہلو ہے ۔ اس کی سوزن کاری سے ماضی اور مستقبل کا اتصال قائم رہتا ہے اور رود زندگی میں تازگی ملتی رہتی ہے ۔ چنانچہ یہ عقل ہی تمام سماجی تجربہ کی روح ہے ۔ یہ عقل غلطی بھی کر سکتی ہے ۔ اس کی راہ سنگلاخ بھی ہے ۔ لیکن یہ اور صرف یہی عقل تمام غلطیوں کے درمیان سیدھی راہ نکال بھی لیتی ہے ۔ اس کی لغزش میں بھی خیر و برکت کے پہلو ہوتے ہیں ۔ اقبال کہتے ہیں :

غلط خرامئی ما نیز لذتے دارد   خوشم کہ منزل ما دور و راہ خم بخم است

ہماری زندگی ایسے نظام العمل اداروں اور سماجی اختراعات سے محروم ہے جن کے ذریعے ہم اسلام کے مثبت اصولوں کی تجسیم کر سکیں اور اخوت انسانی ، مساوات ، زندگی ، احترام آدمیت کا نمونہ دنیا کو دکھا سکیں مگر اس عقل تجربی میں وہ خلاقیت پوشیدہ ہے جو ہماری معاشرت میں ایسا انقلاب لے آئے جو اس وقت اس دنیا کی کہ سرمایہ داری و اشتراکیت کی کشمکش میں مبتلا ہے ، رہنمائی کر سکے ۔

1. See B.A. Dar (ed.), Letters and Writings of Iqbal (Karachi, 1967), p. 81.

اسلام جو ہر قسم کی اجارہ داری کے خلاف اعلان جہاد ہے، ہرگز اس کا متحمل نہیں ہو سکتا کہ کوئی فرد یا طبقہ اس عقل کا اجارہ دار بن جائے ۔ مفاد پرست افراد اور طبقے ہمیشہ اس کی اجارہ داری پر نظر رکھتے ہیں اور ان کا پہلا داؤن اس پر قبضہ کرنا ہوتا ہے ۔ اسلام اس عقل کو سب کا سرمایہ قرار دیتا ہے ۔ اللہ کے سامنے ہر شخص جواب دہ ہے ۔ حیات ملی میں یہ مثل خون گردش کرتی ہے اور یہ گفتگو اور مکالمہ کی صورت میں حیات کو آگے بڑھاتی ہے ۔ لوگ ملتے ہیں ، بحث مباحثہ کرتے ہیں اور اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ، ایک دوسرے کی بات سنتے ہیں ۔ اہل مفاد ان ہی باتوں کے دشمن ہوتے ہیں ۔ وہ رسل و رسائل کے ذرائع پر اجارہ جماتے ہیں ، اخبار و جرائد پر قبضہ کر لیتے ہیں اور ان راہوں کو مسدود کر دیتے ہیں جن کے ذریعہ یہ عقل تجرباتی اپنے مطالب کا اظہار کر سکے ، کچھ سن سکے ۔ کچھ سنا سکے ، پھر اس کے بعد یہ اہل اجارہ اپنی مرضی کے مطابق رائے عامہ کو شکل دینے کی کوشش کرتے ہیں ، ہرگز لوگوں کو جمع نہیں ہونے دیتے ، ان کو مل بیٹھنے اور اجتماعی غور و خوض سے روک کر ان کی روح تنقید ختم کر دیتے ہیں ۔ یہ سب باتیں ایسی محرمات ہیں جو خود اسلام کے خلاف اعلان جنگ ہیں ۔ ان محرمات کی ترویج سے حیات ملی کا ربط ٹوٹ جاتا ہے ، خوب و نا خوب کی پہچان ختم ہو جاتی ہے اور مردنی چھا جاتی ہے ۔ اس صورت میں کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی ۔ خود ملت اسلام میں کسی قسم کا اجتہاد پرورش نہیں پا سکتا ۔ ان کی فقہ و شریعت ، قانون و دستور ، رسم و رواج سب جمود کا شکار ہو جاتے ہیں ۔ جب کوئی قوم اس حال میں ہو تو پوری سماجی زندگی تیزی سے انحطاط کا شکار ہو جاتی ہے ۔ قیاس و اجماع اسلامی ثقافت کے اصول حرکیت ہیں ۔ ان کی بحالی مومن کا دینی فریضہ ہے ۔ چنانچہ ملت اسلام کو کسی قسم کی قربانی سے دریغ نہیں کرنا چاہیے تا آں کہ وہ اجارہ داریاں ٹوٹ جائیں ، جو ان کی راہ میں سنگ گراں کی طرح حائل ہیں اور رائے کی حرمت پھر سے قایم ہو جائے تا کہ قیاس و اجماع اپنا وظیفہ انجام دے سکیں ۔ عقل تجرباتی قیاس اور اجماع کے ذریعے عمل آرا ہوتی ہے ، اور اپنے احکامات کو حیات ملی کا جزو بناتی ہے ۔ اقبال نے ملت بیضا کی تمام تاریخی قوتوں کو جو اس عقل کے کام میں حارج ہیں اور اس کے ارتقا میں مزاحمت کا باعث ہوتی رہی ہیں ، تین گروہوں میں تقسیم کیا ہے : ۱۔ ملائیت ۲۔ صوفیت ۳۔ ملوکیت ۔[۱]

'ملائیت سے مراد ایسی تمام قوتیں ہیں جو مہارت علم و فن اور تعلیم و

[۱] لطیف احمد شروانی (مرتب) ، حرف اقبال (لاہور ۱۹۵۵ء) صفحہ ۱۵۰ ۔

تربیت کی بنیاد پر اس عقل کی اجارہ داری اور حیات ملی کے لیے خوب و نا خوب کی پرکھ ، اچھے اور برے احکامات کا تصفیہ اپنا حق سمجھتی ہیں ۔ در اصل اجارہ دار قوتیں ملت اسلام کے ہر دور میں عامۃالمسلمین کو اسی عنوان بالغ رائے دہی سے محروم کرتی رہی ہیں اور ان کو عقل کے استعمال سے روکتی رہی ہیں ۔

صوفیت سے مراد وہ تمام آدم بیزار روحانیت آمیز قوتیں ہیں جو اس دنیا اور کاروبار دنیا کا ذوق و شوق ختم کرکے قوم کے افراد کو بے حس اور بے بود بنا دیں ۔ یہ قوتیں پچھلے ادوار میں منفی کردار ادا کرتی رہی ہیں اور کاروبار عالم کو خود غرض ابلیسی طاقتوں کے حوالہ کرنے میں مدد و معاون رہی ہیں ۔

ملوکیت سے وہ نظام ہائے امور ملی مراد ہیں جن میں ولایت امور عامۃالخلق پر بیجا، جابرانہ، غاصبانہ، یا تشدد آمیز تسلط سے داغدار ہو۔ ایسے نظام قیاس و اجماع کی فعال قوتوں کو اپنا حریف سمجھتے ہیں اور بعنوان وحدت ملی یا نزاکت حالات تشکیل اجتہاد پر طرح طرح کی پابندی لگاتے ہیں تاکہ اس امت کے اداروں میں کوئی تازہ خون دوڑنے نہ پائے اور اس کے شب و روز میں امید کی کوئی نئی کرن نہ در آئے ۔ ان طاقتوں کے ملے جلے عمل سے ملت بیضا میں جو خطرناک رجحان پرورش پاتے ہیں وہ یہ ہیں :

۱۔ معاملات سے لا تعلقی : خواہ معاملات اور واقعات انفرادی یا قومی حیثیت سے کتنے ہی اہم ہوں لوگوں میں دلچسپی کا فقدان ہوتا ہے ۔ ان میں وہ جیتے جاگتے محرکات نہیں ہوتے جو ان کو معاملات کے اکھاڑے کا جاندار کردار بنا دیں ۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ معاملات بگڑی ہوئی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور معاشرہ ہر طرح کھوکھلا ہو جاتا ہے ۔ افراد اتنے پست ہو جاتے ہیں کہ ترقی کے لیے قریباً ہر شعبۂ حیات میں محرکات پیدا کرنے پڑتے ہیں ۔

۲۔ تعاون عمل و تعامل آرا سے عدم رواداری : اس کے مظاہرے آئے دن ہوتے رہتے ہیں ۔ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں کہ بہت سے مقامات پر جب لوگ کسی کو سننے کے لیے جمع ہوں تو ان کے مخالفین جلسوں کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ اس سے بیجا طور پر امن عامہ کو خطرہ پیدا ہو سکتا ہے ۔ پھر ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ اگر اخباروں یا رسالوں میں کسی نے اپنے زاویۂ نگاہ کا اظہار کیا تو جو لوگ اپنے پیشوایان کی باتوں میں مگن ہیں وہ مظاہرے شروع کر دیتے ہیں ۔ یہ سب حادثات جہاں اس بات کا آئینہ ہیں کہ لوگوں میں وہ محرکات ہی نہیں جو ان کو نئی باتوں یا اجتہاد کی طرف متوجہ کریں وہاں دوسری طرف جبروتشدد کی طاقتوں کے ہاتھ مضبوط کرتے ہیں اور مآل کار اس بات پر منتج ہوتے ہیں کہ اس امت کی باگ ڈور اور

ولایتِ امور غاصبین کے ہاتھ میں ہی رہے - اور اس کی تدبیر منازل میں کوئی خیر و خوبی کی بات نہ پیدا ہو -

ابن نجیم نے جو اسلامی فکر کی تاریخ میں بہت بلند مقام رکھتے ہیں اور پانچویں صدی ہجری میں گزرے ہیں' بڑی دقت نظر سے ان سب لوگوں کو خاموش کر دینے والا جواب دیا ہے - وہ اس عمومی سماجی مظہر کو تسلیم کرتے ہیں کہ لوگوں کی اکثریت اتباع پر قانع ہوتی ہے - وہ یہ بھی مانتے ہیں کہ اہل اجتہاد فکرو نظر بہت کم ہوتے ہیں - وہ یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ اہل دانش و ماہرین فن کا ہی یہ حق ہے کہ وہ قیاس کریں - غرض ان سب مسلمات کو تسلیم کرتے ہیں جو آج کل کے ملائیت پسند اور مشاورت فی الامر (رائے دہی) کو محدود کرنے والے دیتے ہیں مگر اس کے بعد وہ بتلاتے ہیں کہ قیاس و اجتہاد خود بخود احکام شرع نہیں بن جاتے اور منہاج ملی کا جزو نہیں ہو جاتے - مختلف اہل اجتہاد ، اجتہاد کرتے ہیں مگر کسی اجتہاد کو ترجیح سند قبولیت سے حاصل ہوتی ہے - وہی معتبر حکم شرعی ہو جاتا ہے جس کی اتباع عامۃالخلق کرنے لگیں - حکم شرعی سے مراد ایسا حکم ہے جس کا کرنا اچھا اور چھوڑنا ترک خیر اور مستوجب سزا ہے - ہر قیاس اور اجتہاد بلا اجماع غیر معتبر ہوتا ہے - غیر معتبر اجتہاد و اختراع کا نفاذ مداخلت فی الدین اور تحریف شریعت ہے - اسی بنا پر یہ ہر مجتہد کا فرض ہے کہ وہ اپنا اجتہاد عامۃالمسلمین تک پہنچائے اور یہ عامۃالمسلمین کا کام ہے کہ اس اجتہاد فی الدین کو دین کا جزو بنائیں یا نہ بنائیں ، اس پر چلنے کا فیصلہ کریں یا نہ چلنے کا - اس بنا پر عامۃالمسلمین کے جلسے اور مجالس ، اخبار و جرائد ایسے واجبی اور ضروری شرعی وسائل و آلات ہیں جن میں مداخلت نا روا اور حرام ہے - وہ سب اہل اختیار جو لوگوں کو مختلف پیشوایان اور قائدین کو سننے کا موقع نہیں دیتے اور عامۃالمسلمین کے اس شرعی کام میں رکاوٹ ڈالتے ہیں کہ فیصلہ کریں کہ کس کی بات پر چلیں اور کس کی بات پر نہ چلیں ، دراصل زمین پر فساد پھیلاتے اور ملت بیضا کے مستقبل سے کھیلتے ہیں - ان کو اس مذموم کھیل میں صوفیت اور ملائیت سے ہمیشہ تقویت پہنچتی رہتی ہے - عمرانی ترقی کی راہ استوار کرنے کے لیے ملت بیضا کا فرض ہے کہ وہ ملوکیت ، صوفیت اور ملائیت کا قلع قمع کرنے کے لیے جدوجہد کرے تاکہ قیاس و اجماع اس کے تشکیلی ادارے بن جائیں اس لیے کہ ثقافت اسلامیہ اپنے ہر ہر ادارہ اور مجلسی دائرہ میں خود ارادیت کو کار فرما کرتی ہے اور اس کے جملہ وظائف میں استحکام خودی غایت و مقصود ہے - اس کا فلسفہ اتباع و اطاعت اس کے وجدان خود ارادیت کا ایک شعبہ ہے- اس کے اجتماعی

نظام میں اسی کی اطاعت جائز و ضروری ہے جس کی اطاعت خود ارادیت کی شان سے اس نے اپنے اوپر واجب و ضروری قرار دی ہو ۔ وہ اطاعت جس میں اس شان کی توہین ہوتی ہو انحطاط خودی ہے۔ پس چہ باید کرد میں زیر عنوان ''حکمت کلیمی'' اقبال فرماتے ہیں :

تا نبوت حکم حق جاری کند　　پشت پا بر حکم سلطان می زند
در نگاہش قصر سلطان کہنہ دیر　　غیرت او بر نتابد حکم غیر

اس کے مقابل حکمت فرعونی ہے جو اپنی تاویلات اور حیلہ سازیوں سے ایسا طلسم باندھتی ہے کہ خوئے غلامی کو پختہ کرتی ہے ۔ خضر راہ میں فرماتے ہیں :

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری
جادوی عمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں ساز دلبری

اقبال کی نظر تاریخ عالم پر ہے ، ساحری اختراعات کے بے شمار نمونے ان کے سامنے ہیں ، خود ملت اسلام کی تاریخ ان کے سامنے ہے کہ طاغوتیت کس طرح عقل و خرد اور قلب و جگر پر اپنا قبضہ جماتی ہے ، فطرت انسانی و مظاہر عمرانی میں تبدیلی کر دیتی ہے اور نیا دین جاری کرتی ہے ، اپنے جواز کے لیے نئے نئے مسئلے اور نظریے تراشتی ہے ۔ مگر (حکمت فرعونی ، پس چہ باید کرد) :

حکمتے از بند دین آزادۂ　　از مقام شوق دور افتادۂ
مکتب از تدبیر او گیرد نظام　　تا بکام خواجہ اندیشد غلام
شیخ ملت باحدیث دل نشیں　　بر مراد او کند تجدید دیں

اقبال کے ان افکار میں بڑی بصیرت کی باتیں ہیں ۔ اگر ہم خود اپنے مذہبی ادبیات کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ دفتر کے دفتر ایسے مسائل سے اٹے پڑے ہیں جو ان طاغوتی قوتوں کی تقویت کا باعث ہوتے تھے ۔ پھر اس ادب نے مدرسوں پر قبضہ جمایا ۔ طاغوتی نظام کا سب سے پہلا نشانہ نظام تعلیم ہوا کرتا ہے ۔ اس کے ذریعے سے یہ روح پر قبضہ کرتا ہے اور نظر بندی کرتا ہے ۔ اقبال کا خیال ہے کہ صرف چوب کلیم ہی اس نظام سے صف آرا ہو سکتی ہے :

کس حریفش نیست جز چوب کلیم

اقبال اس قوم پر ماتم کرتے ہیں جس کی کار سازی خود اس کے اپنے

ہاتھ میں نہیں ہوتی

وائے قومے تشنۂ تدبیر غیر کار او تخریب خود تعمیر غیر

اس قوم کے ضمیر سے لاکھوں آرزوئیں ابھرتی ہیں اور مر جاتی ہیں ، غیرت مند اولاد سے یہ محروم ہو جاتی ہے اور یہ اس طرح زندگی گزارتی ہے جیسے مردہ قبر میں ۔ اقبال اس نکتے کو وا کرتے ہیں کہ بے حیائی ، بد چلنی اور آبرو باختگی وغیرہ وغیرہ ایسی قوم میں سرایت کر جاتے ہیں (پس چہ باید کرد ، ۱۷) :

از حیا بیگانہ پیران کہن نوجواناں چوں زناں مشغول تن
در دل شاں آرزوہا بے ثبات مردہ زایند از بطونِ امہات
دختران او بزلف خود اسیر شوخ چشم و خود نما و خرده گیر
ساخته پرداخته دل باخته ابروان مثل دو تیغ آخته

اقبال دور جدید کے پہلے مفکر ہیں جنھوں نے آوارہ گردی ، عیاشی ، تضیع اوقات اور بے حیائی جیسے سماجی رزائل کا سبب اولی خود ارادیت سے محرومی ، غلامی اور طاغوتیت کو قرار دیا ۔ معترضین یہ کہیں گے کہ اقوام یورپ تو آزاد ہیں ، پھر ان میں حیا سوزی اور آبرو باختگی دیگر اقوام سے کہیں زیادہ ہے ۔ اقبال کا جواب یہ ہے کہ اقوام مغرب میں جمہوریت کا نام ہی نام ہے ۔ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت وہاں کے عوام اس طرح پس رہے ہیں کہ آزادی اور حریت ، خودی و غیرت کا ان میں خاتمہ ہو گیا ہے ۔ محض چند رسمی اداروں کے قیام سے جمہوریت نہیں آ جاتی ۔ خود ارادیت ایک طرز حیات ہے جو حیات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے ۔ یہ ایک خاص مجلسی زندگی چاہتا ہے ۔ اسی کے ہم آہنگ معاشی زندگی ، اسی کے مماثل آئین اور قانون ۔ اقبال کہتے ہیں :

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیوِ استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے ، یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے ، اثر خواب آوری
گرمیِ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داروں کی ہے جنگِ زرگری

اپنے عمرانی افکار میں اقبال اس حقیقت تک پہنچ چکے تھے جس کو بہت سے مغربی مفکر اور ماہران سیاست چھپاتے پھرتے ہیں کہ سلطانیِ جمہور اور نظام سرمایہ داری ایک ساتھ نہیں چل سکتے ۔ سرمایہ دارانہ استیصال بہت آسانی

سے جمہوریت کا روپ دھار لیتا ہے اور اس روپ سے عوام کو دھوکہ دے کر روح کو کچل دیتا ہے ۔ مغرب کا موجودہ طرزِ حیات اور سماجی ڈھانچہ اسی لیے بے حیائی اور بے غیرتی کے گرداب میں ہے ۔ وہاں نوجوانوں میں بے راہ روی اور بالغوں میں اخلاقی بے حسی فروغ پا رہی ہے ۔ اس نظام میں خودی پارہ پارہ ہو چکی ہے اور مغربی انسان سرمایہ دارانہ مشین کا ایک کل پرزہ بن کر انفرادی اثبات ، استحکام اور سوز دروں کھو چکا ہے ۔ چنانچہ عابلی زندگی کا انتشار روز افزوں ہے ۔ محبت و مودت ، اپنے اور بیگانوں کا خیال ، یہ سب جذبات عالیہ رفتہ رفتہ ناپید ہوتے جاتے ہیں ۔ دیکھیے پس چہ باید کرد (صفحہ ۱۷) :

ملتے خاکستر او بے شرر صبح او از شام او تاریک تر
ہر زمان اندر تلاش ساز و برگ کار او فکر معاش و ترسِ مرگ

اقبال مارکسی انقلاب کا خیر مقدم کرتے ہیں ۔ ان کو اس انقلاب کا یہی پہلو پسند ہے کہ یہ سرمایہ داری کی نفی ہے (پس چہ باید کرد ، صفحہ ۲۱-۲۲) :

روس را قلب و جگر گردیدہ خون از ضمیرش حرف لا آمد برون
کردہ ام اندر مقاماتش نگہ لا سلاطین ، لا کلیسا ، لا الہ

مگر مارکسی انقلاب نے اقبال ، کا خیال تھا ، ابھی اثبات کے کوچہ میں قدم نہیں رکھا ۔ اس لیے اس انقلاب کو وہ ناتمام خیال کرتے تھے اور ایک اور عظیم انقلاب کا دیباچہ سمجھتے تھے ۔ وہ عظیم انقلاب قرآنی انقلاب ہوگا ۔ چنانچہ ملت روسیہ کو جمال الدین افغانی کے واسطے سے ایک پیغام دیتے ہیں اور مسلمانوں کی مثال دے کر متنبہ کرتے ہیں کہ (جاوید نامہ صفحہ ۸۷) :

منزل و مقصود قرآن دیگر است رسم و آئین مسلمان دیگر است
در دلِ او آتش سوزندہ نیست مصطفٰی در سینۂ او زندہ نیست
بندۂ مومن ز قرآن بر نخورد در ایاغِ او نہ مے دیدم نہ درد
خود طلسمِ قیصر و کسریٰ شکست خود سر تخت ملوکیت نشست
تا نہالِ سلطنت قوت گرفت دین او نقش از ملوکیت گرفت
از ملوکیت نگہ گردد دگر عقل و ہوش و رسم و رہ گردد دگر

ان کو اندیشہ ہے کہ کہیں یہ انقلاب تاسیس آمریت کا باعث نہ ہو اور معاشی مساوات کے لیے سیاسی جبریت کی ترویج کا سبب نہ بنے ۔ یہ صورت بھی افراد اور اقوام کی موت ہے ۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے قیصر و کسریٰ کا طلسم توڑا تھا مگر خود ملوکیت کی تجدید کا باعث ہو گئے ۔ ہماری اس داستان سے عبرت لو ۔ جانو کہ اس جہان کو ایسی ملت کی ضرورت ہے

جو ایک دوسرے کے لیے بشیر ہوں اور نذیر ہوں ۔ موجودہ اشتمالی آمریت کا کمزور ترین رخ یہی ہے کہ بشارت اور نذارت کے وظیفے سے عوام اور جمہور محروم ہیں ۔ ان کا کام آسنا و صدقنا سے زیادہ نہیں ہے ۔ یہ مزدکیت نو سماجی اختراعات و ایجادات کا ایک ایسا نظام ہے جس میں افراد رسل و رسائل، ربط و ضبط، تنقید و نظر، اور ان تمام بین الافرادی وسیلوں سے محروم ہیں جن کے ذریعے وہ ایک دوسرے کی اصلاح کر سکتے ہوں، اپنے حکمرانوں کا احتساب کر سکتے ہوں ۔ چنانچہ اس مزدکیت میں ایک اور انقلاب کے اسباب جمع ہو رہے ہیں :

اے کہ می خواہی نظامِ عالمے جستہ ای او را اساس محکمے ؟

انسان سے اس کی پوری شخصیت محض روٹی کے معاوضہ میں لے لینا شکست آدمیت ہے ۔ اس شکست سے پھر ایک مرتبہ استیصال کی راہیں ہموار ہوتی ہیں ۔ ایسی اختراعات اور اعمال و تدابیر سے روک کا کوئی سامان نہیں ہو سکتا جو بانداز دیگر طاغوتی نظام کی تجدید ثابت نہ ہوں ۔ انقلاب اکتوبر سنہ ۱۹۱۷ء سے ابتک اشتراکیت نے جہاں سرمایہ داری کے خلاف ایک بڑی ریاستی اور ملی ضمانت کی حیثیت سے ثابت قدمی کا ثبوت دیا ہے، وہاں عمرانی اور سیاسی حیثیت سے وہ صرف ایک طاغوتی نظام کا ہی درجہ رکھتی ہے ۔ اس کے ادارے انتظامی اور مملکتی طاقت کے ایسے اہرام ہیں جن میں افراد قوم صرف اینٹ اور گارے کا کام دیتے ہیں ۔

اقبال اس لیے مغربی سرمایہ داریت اور اشتراکی مزدکیت دونوں راستوں سے ہٹ کر اسلام کی دعوت دیتے ہیں ۔ انھوں نے کوئی تفصیلی خاکہ تو پیش نہیں کیا مگر چند بنیادی باتیں اس نظام کی پیش کی ہیں ۔ سب سے پہلی تو یہ ہے کہ تمام بنی نوع انسان کو ایک سمجھا جائے ۔ دوسری یہ کہ تمام مال و متاع کا مالک خدا کو سمجھا جائے اور انسانوں کو محض امین اور تیسری اہم بات نظام ربأ کا خاتمہ ہے ۔ سرمایہ داری کی بنا صرف ان دو فریب کاریوں پر قائم ہے : ایک تو یہ کہ انسان مال و متاع کے مالک ہیں اور دوسری یہ کہ سود خواری ایک جائز قانونی اور انسانی حق و عمل ہے ۔ جب اقبال یہ بیان کرتے ہیں کہ تمام بنی نوع انسان کو ایک سمجھا جائے اور مال و متاع کو محض ایک امانت سمجھا جائے تو وہ ہرگز عقیدہ یا خیال کی درستگی کی بات نہیں کہتے ۔ اس دائرے میں وہ معتقدات کی حد میں نہیں بلکہ سماجی دائرے میں ہیں ۔ یہاں وہ ایسے نظام کی تشکیل اور ایسے سماجی اختراعات کی دعوت دیتے ہیں جن کو ہم مذکورہ بالا کلیات کی شکل میں بیان کر سکیں ۔

اقبال نے بہرحال فقہ اسلام اور آئین اسلام کا ایک واضح معیار معاشی زاویۂ نگاہ سے ضرور بیان کیا اور تاکیداً بیان کیا کہ اس سے عوام کے معاش کا مسئلہ

حل ہوگا ۔ انہوں نے ایک خط میں قائداعظم سے کہا کہ میں نے اسلام اور قانون اسلام کا مطالعہ کیا ہے اور اس نتیجہ تک پہنچا ہوں کہ اس کے نفاذ سے عامۃ الناس کے روٹی پانی کا مسئلہ حل ہوگا ۔ انہوں نے اپنے کلام میں جگہ جگہ اس کا اشارہ کیا ہے کہ اسلامی ادبیات کا بڑا حصہ ''سلطانی و ملائی و پیری'' کے مفادات کے مطابق مدون ہوا ہے اس لیے قطعی طور پر نظر ثانی کا محتاج ہے ۔ وہ تمام فقہ جو ''غیر مکتسب آمدنیوں'' کا جواز فراہم کرے ، محنت پیشہ کو اس کی محنت کے پھل سے محروم کرے ، افلاس میں اضافہ کا باعث ہو اور دولت کے ارتکاز کے لیے شرعی وسیلے فراہم کرے دین اسلام میں بہت بڑا دجل ہے ۔ یہ ایسی ہی فقہ ہے جس نے اسلام کا اقتدار غاصبین اور جابرین کے حوالے کیا اور مسلمانوں کے سامنے ان کو امام ملت وغیرہ کے عنوان سے پیش کیا ۔ اس لیے اقبال شدت سے قانون اسلام کی تشکیل جدید کی ضرورت محسوس کرتے تھے ۔ اسلام صرف ایسے آئین اور فقہ کا متحمل ہو سکتا ہے جو انسانی خودی کے استحکام کے لیے سامان فراہم کر سکے ، اس کے بنیادی حقوق کی تکمیل کے حقیقی وسیلے فراہم کر سکے ، کسی ایک قدر کی خاطر زندگی کی دوسری اقدار واپس نہ لے لے اور جس میں ترقی کا یہ پیمانہ رائج ہو کہ ان اقدار کی کس درجہ تکمیل اور توسیع ہوئی ۔

بزم حیات کی آراستگی اور اس کی خاطر استحکام خودی ، انسانوں کے لیے ارضی معاملہ ہے ۔ زندگی کی خلاق قوتیں صحت مند اور توانا اداروں کا تجربہ کرتی رہتی ہیں اور ان میں فعال تغیر و تبدل کرتی رہتی ہیں مگر اس سارے تغیر و تبدل پر جس پر سارے حال و مستقبل کا انحصار ہوا کرتا ہے ذرائع اور وسائل کی بھی حدیں عائد ہوتی ہیں ۔ جن قوموں کے پاس ذرائع اور وسائل کی کمی ہوتی ہے ، وہ صرف افلاس اور آفات کی ہی اپنے افراد میں منصفانہ تقسیم کر سکتی ہیں ۔ بزم وجود میں افراد کی باہمی ہم آہنگی اور مساوات زندگی کا منشأ ، جو خیرو برکت کی فضا سے معمور ہو صرف اس صورت میں پیدا ہو سکتا ہے کہ ضرورتوں کے پورا کرنے کے وسائل میں توسیع اور ضروری پیداوار میں اضافہ ہو ۔ ان ہی ذرائع اور وسائل سے طبعی ماحول ہماری تمدنی زندگی کا ایک حصہ بنتا ہے اس لیے سماجی زندگی کا اہم ترین وظیفہ ان ذرائع اور وسائل کی ترقی ہے ، عددی اور کیفی ترقی ۔ اس کو اصطلاح عام میں آج کل سرمایہ کاری کہتے ہیں ۔ سائنسی نقطۂ نظر سے یہ فنیاتی اطلاق اور ارتکاز ہے ، فلسفیانہ انداز میں اس کو تسخیر کائنات کہتے ہیں ۔ ویسے حیاتی نقطۂ نظر سے یہ انجذاب و باز آفرینی فطرت ہے ۔ سرمایہ کاری ان تمام ایجادات ، اختراعات ، کل پرزوں ، آلات و اوزار ، تنصیبات ، مواصلات وغیرہ وغیرہ پر مشتمل ہوتی ہے جن سے کوئی معاشرہ ذخیرۂ قدرت کو کام میں لا کر اشیائے ضرورت حاصل کرتا

ہے - تمام پیداوار اور ثروت اس سرمایہ کاری کے تناسب سے معین ہے - چنانچہ ایک ملک اور دوسرے ملک میں سالانہ پیداوار کا فرق اسی سرمایہ کاری کے فرق سے ہوتا ہے - مشرقی اقوام میں سرمایہ کاری کی سطح بہت گری ہوئی ہے - اس سطح کو مسلسل بلند کرنا قومی زندگی کے لیے از بس ضروری ہے - اسی سے بیماری ، افلاس اور جہالت کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے - اس لیے مقرون اجتماعی نصب العین سرمایہ کاری کے تیز سے تیز تر اضافہ کو قرار دیا جا سکتا ہے - یہ کوئی مادی نصب العین نہیں ہے - اس کا منشا بہتر انسانوں کی تخلیق اور انسانوں کے لیے بہتر ماحول فراہم کرنا ہے - اس وجہ سے یہ ایک روحانی نصب العین ہے - سرمایہ کاری اسی لیے ارضی حیات کی مستقل قدر ہے جس کو کسی حال ماتوی نہیں کیا جا سکتا اور نہ اس میں کمی آنے دی جا سکتی ہے - عام الفاظ میں یہ تمام سماجی اور عمرانی تدابیر کا یوں سمجھیے کہ ارضی یا مادی پہلو ہے - اسلام اس پہلو کو جہاد کہتا ہے - اقبال نے اپنے ایک مشہور شعر میں اس حدیث رسول اکرم کا حوالہ دیا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ تمام روئے زمین میری مسجد ہے - اس طرح یہ پوری زمین مقدس ہے - مومن کی حیات اور شعور اس کا داخلی پہلو ہے - چنانچہ اقبال نے یہ بحث مدلل کی ہے کہ اسلام میں روح اور مادہ کی ثنویت نہیں ہے - وہ ان کے باہم تسلسل کے قائل ہیں[۱] - اس بحث کو زیادہ مقرون طور پر یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ خارجی نقطۂ نظر سے سرمایہ کاری سماج کا محسوس و مجسم سلسلہ ہے جب کہ داخلی طور پر سماج حیات شعور اور عمل کا ایک دریائے بیکراں ہے - جس طرح کسی روح کا وجود جسم کے بغیر نہیں اور جہاں کہیں روح ہے وہاں اس کا جسد خارجی بھی وجود رکھتا ہے ، اسی طرح بزم عمرانی بھی ایک خیال بے پیکر نہیں - نظام سرمایہ کاری اس کا جسم ہے ، حیات ہزار مذاہب جسم ہزار ہیں اور سرمایہ کاری کو نری مادیت قرار دے کر اقوام و ملل کو کمزور کرتے ہیں - اسلام نے بار بار یہ جتلا کر کہ ہم نے زمینوں ، آسمانوں ، چاند ، سورج ، چوپایوں ، دریاؤں پہاڑوں وغیرہ کو تمہارے لیے مسخر کیا ہے سرمایہ کاری کی دعوت دی ہے -

اسلام عینی طور پر دوسری ثقافتوں سے اس لیے ممیز ہے کہ سرمایہ کاری کا اپنا منفرد طریقہ ایجاد کرنے پر مامور ہے - شریعت اسلام میں واضح طور پر افراد انسانی کو کفایت شعاری کی تعلیم دی گئی ہے - تمام سرمایہ کاری کفایت شعاری کا تفاعل ہے - جتنی زیادہ صرف میں کفایت ہو گی ، وہ کفایت مال و اسباب کو سرمایہ کاری میں مشغول کر سکے گی اور اس ازدیاد سرمایہ کاری سے

۱- تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ، مترجمہ نذیر لیازی ، ۱۵۹-۱۶۰ -

کلی پیداوار میں اضافہ ہوگا جو سب کے کام آئے گا ۔ اس لیے کفایت شعاری کو منہاج اسلام کا درجہ حاصل ہے ۔ مسلم معاشرہ اسی سے توانائی حاصل کرتا ہے اور اپنے استحکام میں اضافہ کرتا ہے ۔ انفرادی کفایت شعاری اجتماعی سرمایہ کاری ہے اور مجموعی فلاح و بہبود ہے ۔ یہ ملت اسلام کی دائمی حکمت عملی کا اصول ہے جس سے سماجی ترقی کے ہر وقت تازہ امکانات پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ اپنی تنظیمی شکل میں ملت اسلام نظم و ضبط کا مربوط سلسلہ ہے جو تعیش اور اسراف کی تادیب کرتی رہتی ہے اور کسی کو جادۂ مستقیم سے ہٹنے کی اجازت نہیں دیتی۔

سرمایہ کاری کے طریقوں، پیداوار کی نوعیت و مقدار اور تقسیم دولت میں باطنی ربط و تعلق ہوتا ہے ۔ صحت مند نظام عمرانی ایسے میکانزم پیدا کرتا رہتا ہے جو ان طریقوں اور اداروں کو وجود میں لاتے ہیں جن سے پیداوار کی نوعیت اور مقدار احتیاجات عامہ کو منصفانہ طور پر پورا کرتی ہے اور نیز اسباب زندگی اس طرح تقسیم ہوتا ہے کہ لازمی طور پر کم و بیش ایک عام مساوات قائم ہو جاتی ہے ۔ اہل طاغوت کے ہاں سرمایہ کاری کا ہر اضافہ صرف چند افراد کے ہاتھ میں جو ایک مخصوص طبقہ بن جاتے ہیں، وسائل دنیا مرتکز کر دیتا ہے، دوسرے طبقات محتاج سے محتاج تر ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ اقبال کے عمرانی افکار ایسے تمام مدنی نسیجوں ، اجتماعی تنصیبوں ، ادارتی سانچوں اور آئینی تعاملوں کو متزلزل کرتے ہیں جو ان کی ابلیسیت کے مظاہر ہیں ۔

مسلم سماجی فکر کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ اس نے ثقافت اسلام کے اٹمٹ نقوش کی خود غلط تعبیر و تاویل کرکے ان کی وجودیاتی قدر و قیمت گھٹا دی ۔ ہمارے افکار کے افلاس کا یہ عالم ہے کہ ایسے بیشتر واقعات کو جو ثقافت اسلامیہ کی علامت بن چکے ہیں ہم شخصی اخلاق کی بلندی کی مثال قرار دے کر انفرادی واقعات میں شمار کرتے ہیں ۔ مثلاً یہ واقعہ کہ ایک شخص نے برملا کھڑے ہو کر کہا کہ ہم حکم نہیں مانیں گے اور بات نہیں سنیں گے جب تک ہمیں یہ بتلایا نہ جائے کہ ہم یہ جو تم لمبا کرتا پہنے ہوئے ہو یہ کس طرح بنا ، ایک چادر سے تو بن نہیں سکتا اور جب تک اس سوال کا جواب تسلی بخش نہ مل سکا کام نہ بنا ۔ پھر یہ واقعہ کہ بیت المقدس کے فاتح کا اس حال میں استقبال ہوتا ہے کہ اس کا خدمت گار اونٹ پر سوار ہے اور وہ خود اونٹ کی نکیل ہاتھ میں تھامے ہوئے چلا آتا ہے ۔ احتساب و مساوات کے ایسے بہت سے واقعات یادگار ہیں مگر ہم ان کی تاویل ان بزرگوں کے علو اخلاق سے کرتے ہیں اور ان کی نفسی پاکیزگی پر محمول کرتے ہیں ۔ پھر اس کے بعد ان کو انفرادی کردار کے نمونوں کے طور پر بیان کرتے ہیں ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ واقعات ایک خارجی اور معروضی نظام کے جزوی اور

داخلی مظاہر ہیں ۔ اگر ایک شخص برملا احتساب کر سکا تو اس لیے کہ وہ عمرانی ماحول ایسا ہی تھا اور اجتماعی معاملات کی تالیف اسی طرح ہوئی تھی کہ ایسے واقعات کا ظہور ان کے تمدن کا فطری تقاضہ تھا۔ چنانچہ یہ کوئی بے مثل واقعات نہیں ہیں ۔ یہ تو روزمرہ کے معمولات میں سے تھے ۔ مجلسی ، آئینی ، معاشی زندگی کی کشیدہ کاری ان سے ہوتی تھی اور پورا سماجی ڈھانچہ ان سے بنتا تھا ۔ چنانچہ ہر شخص اپنا رویہ اس کے مطابق رکھتا تھا ۔ یہ وہی نظام ہے جہاں مال و متاع حلال واسطوں سے آنے کے باوجود اہل متاع و دولت کے پاس امانت خدائی یا اجتماعی ہوتی تھی ۔ مجال نہ تھی کہ ایک آدمی کو جو کی نان خشک بھی نہ ملے اور دوسرا آدمی میدہ کی روٹی کھاتا ہو ، ایک کے بدن پر حریر ہو اور دوسرے کے بدن پر روئی کا چیتھڑا بھی نہ ہو ۔ یہ وہی نظام ہے جس میں ہر والی امر کو ہر بات کا جواب دینا پڑتا تھا اور سب سے بڑا حاکم سب کے سامنے اپنے اعمال کا حساب پیش کرنے پر مجبور تھا ۔ جن باتوں کو ہم ان اصحاب کی ذاتی فضیلتیں کہتے ہیں وہ اس نظام کی اجتماعی فضیلت کا لازمی جز تھیں اور وہ لوگ ہر آن اپنے اس نظام کی حفاظت کرتے تھے جس میں رزق سب کو بہم پہنچتا تھا ۔ بلال یا ابو ہریرہ یا ابوذر ایسا ہی کھاتے پہنتے اور اوڑھتے تھے جیسا سعد بن وقاص یا عمرو بن عاص یا علی بن ابی طالب یا عمر بن خطاب ۔ یہ کسی کے لیے ممکن نہیں تھا کہ وہ حرام راستوں پر اپنے اکل حلال کو لگائے یا دولت کے انبار لگائے ۔ احتساب معاملات ہر شخص کا فریضہ تھا ۔ جب کبھی اور جہاں کہیں سے اس جادۂ مستقیم سے انحراف کی خبریں آتی تھیں فوراً حاکمانہ اختیارات کے ذریعہ یہ معاشرہ اپنے اس انحراف پر قابو پا لیتا تھا ۔ اس اجتماعی سنت سے اسلام کا یہ نکتہ مدون ہوتا ہے کہ قانون اور حکومت فعال ادارے ہیں جو حسب ضرورت اپنا اظہار کرتے ہیں اور یہ کہ ضرورت کا تعین اجتماعی مساوات زندگی سے ہوتا ہے ۔ جب تک عبدالرحمن بن عوف ایسا ہی کھاتے پیتے ہیں ، اسی معیار پر زندگی گزارتے ہیں جس پر دوسرے تمام اور لوگ ، لگ بھگ ایسے ہی مکان میں رہتے ہیں جیسے کہ دوسروں کے پاس ہیں اور دولت جمع نہیں کرتے بلکہ صرف کر دیتے ہیں جو ان کی ضرورت سے زائد ہو دوسروں کی ضرورتوں پر ، تب تک ان سے بذریعہ حکومت یا قانون دولت لے لینے کی کوئی وجہ نہیں ہے ۔ حاکم کوفہ کی حویلی نذر آتش کر دی گئی اور یہ کام حکومت نے کیا اس لیے کہ یہ تمدن کسی فرد کو اسراف کی اجازت نہیں دے سکتا تھا ۔ ہم ان اسباب کا یہاں تجزیہ نہیں کریں گے کہ کس طرح یہ تمدن تباہ ہو گیا ۔ مگر اس بات کا ہمیشہ اعادہ کرتے رہیں گے کہ یہی تمدن اسلام ہے اور اسی کا احیا اسلام کا اخلاقی، روحانی اور سیاسی

نصب العین ہے ۔

جاوید نامہ میں جمال الدین افغانی کی زبانی اقبال نے روس کو جو پیغام دیا تھا، وہ اسی طرز زندگی کا تھا ۔ اس تمدن اور روسی تمدن کا فرق عیاں ہے ۔ اشتراکیت، جدید احتساب اور دار و گیر کا کوئی موثر طریقہ اپنے نظام میں پیدا نہیں کر سکتی اور یہی برائی اس کو ایک ایسے طبقاتی نظم میں تبدیل کر دیتی ہے جس میں نہ تو آمدنی کی مساوات ہے ، نہ معیار زندگی کی مساوات ، نہ اختیار و احتساب کی مساوات و تنظیم ۔ چینی انقلاب ابھی تک معیار زندگی کی ایک عام مساوات پر کار بند ہے مگر اس مساوات کو استقلال دینے کے ذرائع سے وہ بھی محروم ہے یعنی وہ کوئی ایسا سماجی میکانزم نہیں پیدا کر سکا ہے جس کے ذریعہ عوام میں سے ہر فرد اپنے کو اتنا طاقتور پائے کہ وہ احتساب کا وسیلہ اختیار کر سکے اور اس کے واسطے سے اہل انحراف کو اپنی مرضی سے برخواست کرسکے یا کروا سکے اور تعمیری تبدیلی کے لیے جدوجہد کر سکے ۔ اس لئے یہ نظام آب حیات سے محروم ہے ۔ یہ تعمیر نو ہے مگر اس میں خود گری و خود نگری کا سامان نہیں ہے ۔ اقبال کے عمرانی فکر کا پیام یہ ہے (مسافر) :

برخور از قرآن اگر خواہی ثبات　　در ضمیرش دیدہ ام آب حیات
می دہد ما را پیام لا تخف　　می رساند بر مقام لا تخف

وہ عصر حاضر کو دعوت انقلاب دیتے ہیں ۔ وہ ساری انسانی کائنات اور تمام نظم عمرانی میں قیامت خیز انقلاب چاہتے ہیں ۔ وہ ملت اسلامیہ کے کہنہ نظام اور تمدن مغرب کو یکسر ملیامیٹ کرنا چاہتے ہیں تا کہ پائدار مدنیت کی تعمیر ہو سکے ۔ اس باب میں وہ کسی سمجھوتے کے قائل نہیں ہیں ۔ ان کا فلسفہ ہے کہ (پس چہ باید کرد ۱۹-۲۰) :

در جہان آغاز کار، از حرف لا ست　　این نخستین منزل مرد خداست
ملتے کز سوز او یک دم تپید　　از گل خود خویش را باز آفرید
لا مقام ضرب ہائے پے بہ پے　　این غو رعد است نے آوازِ نے
ضرب او ہر بود را سازد نبود　　تا بروں آئی ز گرداب وجود

ثقافت اسلامیہ کے مسائل کا تجزیہ کرتے ہوئے اقبال فقر و درویشی کو واضح کرتے ہیں جو اس کے نظام وجود میں ابھی سوئی ہوئی ہے اور اس کا تقابل اُس درویشی سے کرتے ہیں جو اس غیر اسلامی ثقافت میں ہے جس کو ہم نے ولایت مدار تمدن کہا ہے ۔ وہ درویش جس کا سر چشمۂ ہدایت شعور نبوت ہے ایسا ہوتا ہے کہ (پس چہ باید کرد ، ۲۳) :

برگ و ساز او ز قرآن عظیم　　مرد درویشے نہ گنجد در گلیم

وہ کہتے ہیں کہ درویش وہ نہیں ہے جو گلیم کے اندر دبکا ہوا ہو بلکہ درویش وہ شخص ہے جس کے ایک نفس سے سینکڑوں انجمنوں میں گرمی پیدا ہو، جو پر پرواز سے محروم لوگوں کو ذوق پرواز عطا کرے اور معمولی حقیر جانور کو شہبازی سکھلائے۔ درویش وہ ہے جو خلق کو جبر و قہر سے نجات دلوائے اور سلطان کے سامنے لا ملوک کا نعرہ بلند کرے۔ قرآن جس فقر و درویشی کی تعلیم دیتا ہے وہ ہست و بود کا احتساب ہے۔ یہ وہ فقر ہے جس کی تاثیر سے بندہ مولا صفات ہو جاتا ہے۔ کافر کا فقر خلوت دشت و صحرا ہے، مومن کا فقر یہ ہے کہ بحر و بر پر لرزہ طاری ہو جائے۔ اقوام حاضر کا علاج انقلاب ہے کہ وہ لا کی ضرب کلیم سے پورے ساجی ڈھانچے کو تہ تیغ کر دیں۔ درویش کافر کے لیے زندگی غار کوہ کے سکون میں ہے مگر درویش قرآن کے لیے مرگ باشکوہ میں ہے۔ اقبال ماتم کرتے ہیں کہ (پس چہ باید کرد):

وائے ما اے وائے این دیر کہن تیغ لا در کف نہ تو داری نہ من

پھر کہتے ہیں:

تا کجا بے غیرت دین زیستن اے مسلمان مردن است این زیستن
بر عیار مصطفیٰ خود را زند تا جہانے دیگرے پیدا کند

اقبال اس قوم پر آہ کھینچتے ہیں جس میں میر و سلطان تو ہیں مگر درویش کوئی نہیں۔ ''مسلم قوت دین سے بدظن ہے اور اپنے کاروان کا خود رہزن ہے۔ اس کی زندگی میں سوز ہے نہ سرور باطنی۔ وہ پست فکر، دوں نہاد اور کور ذوق ہے۔ اس کے مکتب و ملا کور ذوق ہیں، وہ کج اندیشی سے خوار ہے اور اس میں ذوق انقلاب مردہ ہے۔ مفلس قلاش و بے پرواہ ہے۔ اس کے شیخ فرنگی مالکوں کے مرید ہیں اگرچہ مقام بایزید سے گفتگو کرتے ہیں اور محکومی کو رونق دیں بتلاتے ہیں۔[۱]''

اقبال مرد حر کے شمائل میں یوں رنگ بھرتے ہیں: ''مرد حر کو استحکام لاغنف سے ہے۔ ہم میدان میں سر جھکائے ہوتے ہیں، وہ سر بکف ہوتا ہے۔ لا الہ سے اس کا ضمیر روشن ہوتا ہے۔ وہ سلطان و میر سے بندھا نہیں ہوتا۔ ہم سب فرنگ کے بندے ہیں مگر وہ خدا کا بندہ ہوتا ہے۔ ہمارے صبح و شام ساز و برگ کی فکر میں بسر ہوتے ہیں لیکن انجام کار ہمارے لیے تلخی موت ہے۔ مگر اس جہان بے ثبات میں اس کو ثبات حاصل ہوتا ہے، اس کی موت بھی حیات کے مقامات میں سے ہوتی ہے۔ اس کی ضرب سے کوہ گراں پاش پاش ہو جاتا ہے جب کہ ہم خس و خاشاک کی طرح اسیر گرد

۱۔ س چہ باید کرد، ۲۳-۳۱۔

ہوتے ہیں''[۱] ۔

اقبال کے افکار میں مرد درویش اور مرد حُر سماجی علامتیں ہیں ۔ ان سے مراد وہ انقلابی انسان ہیں جو نظام کہنہ میں لرزہ پیدا کرتے ہیں اور اپنی ضرب سے اس کو پاش پاش کر دیتے ہیں ۔ یہ وہ لوگ ہیں جو نئی ثقافت کی طرح اندازی کرتے ہیں جس کی بنیاد امتیاز خوب و ناخوب اور اکل حلال پر ہوتی ہے ۔ اقبال ''یورپ پر افسوس کرتے ہیں کہ وہ اس مقام سے آگاہ نہیں ہے جسے حلال حرام کا علم کہتے ہیں ۔ کمزوروں سے روٹی چھین لینے اور تن سے جان نکال لینے کو وہ حکمت جانتا ہے ۔ تہذیب نو کا شیوہ آدم دری ہے جو سوداگری کے پردے میں ہوتی ہے ۔ چنانچہ اس کی فکرِ چالاک نے نظام بینکاری ایجاد کیا ہے اور نور حق کو انسان کے سینے سے اڑا لیا ہے ۔ جب تک اس نظام کو تہ و بالا نہیں کیا جاتا تہذیب اور دین سب سودائے خام ہیں[۲]'' ۔ واضح ہو کہ بینکاری ایسا نظام ہے جس میں چپکے چپکے ساری قوم کا مال و متاع جمع کر لیا جاتا ہے یا اکٹھا ہوتا ہے اور پھر یہ مال و متاع اہلِ تمول کے لیے ذریعۂ اضافۂ دولت و اقتدار بنتا ہے ۔ وہ اس کو مشغول کرکے اپنی دولت میں اور اضافہ کرتے ہیں ۔ اس کا نام انھوں نے نظام اعتبار و سوداگری و شغل سرمایہ رکھا ہوا ہے ۔ اس نظام میں جو جتنا زیادہ مال و متاع کا مالک ہو وہ اتنا ہی صاحب اعتبار ہوتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ بینکرز کے بہتے مال سے مستفید ہوتا ہے ۔ سرمایہ دارانہ مدنیت جس کا مقصد ارتکاز دولت ہے ، وہ اسی نظام کے وسیلہ سے ترقی پاتا ہے ۔ اقبال کہتے ہیں :

تا تہ و بالا نہ گردد این نظام دانش و تہذیب و دین سودائے خام

اقبال کہتے ہیں کہ حیات کی گہرائیوں سے شریعت یعنی آئینِ عمرانی کی اساس ہونی چاہیے اور اس کا پہلا فلسفہ خوب و ناخوب کی پرکھ ہے ۔ اگر دنیا کو حلال و حرام کی تمیز ہو جائے اور اپنے نظام میں وہ اس پر کاربند ہو تو قیامت تک کے لیے استواری پیدا ہو جائے ۔ فقیہان امت کو یہ درک حاصل نہیں ہے کہ وہ حرام و حلال کا فرق بتا سکیں ۔ اس کے لیے ایک نئی بصیرت درکار ہے جس کی بنیاد عدل و تسلیم و رضا پر ہو اور جس کا سرچشمہ مصطفٰی (علیہ الصلوٰۃ والسلام) کا ضمیر ہو ۔ امت اسلامیہ کو نصیحت کرتے ہیں کہ یاد

۱- پس چہ باید کرد ، ۲۳-۳۱ ۔
۲- ایضاً ۳۷-۳۸ ۔

رکھو بحر (بحر خداوند) سے جان لب پر ہی کیوں نہ آ جائے ، وصل تلاش کرنے کی بجائے اس کی رضا جوئی تلاش کرو ۔ اقبال کی اس نصیحت میں سرِّ نبوت ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ مصطفیٰ کو اس کی رضا کی خبر ہے اور دین اس رضا جوئی کے علاوہ اور کچھ نہیں ۔ اس شریعت کے ذریعے احسن تقویم حاصل کرو اور اپنے آپ کو ابراہیم کے ایمان کا وارث بناؤ ۔ اور :

در جہان اسرار دین را فاش کن نکتۂ شرع مبین را فاش کن

اقبال اس نتیجے تک پہنچے ہیں کہ :

کس نہ گردد در جہان محتاج کس نکتۂ شرع مبین این است و بس

اقبال کی نظر فقیہوں کی طرفہ طرازیوں پر ہے جو صدیوں سے جاری ہیں ۔ انھوں نے طرح طرح کی تاویلات سے دین اسلام کو بدل دیا ہے ۔ انھوں نے مفت خور خواجاؤں کو امرائے اسلام اور عیش کوش فرعونوں کو شکوہ اسلام قرار دیا اور مسلمانوں پر بہت ہی کرب ناک پست کنندہ نظام ہائے روز گار کو مسلط کرنے کے لیے حیلے حوالے پیدا کیے ۔ وہ کہتے ہیں کہ مکتب وملا بڑی سخن طرازیاں کرتے ہیں مگر مومنوں کو اسی نکتہ کی شناخت پیدا نہیں ہونے دیتے ۔ زندہ قومیں تاویلوں سے مردہ ہو جاتی ہیں ۔ چنانچہ وہ جو علم قرآن و حدیث کے مدعی ہیں شریعت میں کم سواد و بے نظر ہیں ، ان کی عقل و نقل اور دلیل و پسند محض ہوس کی بندش میں ہیں ، ان کا منبر دراصل نان کی تپائی ہے ۔ یہ وہ کلیم ہیں جن کے ہاتھ میں ید بیضا نہیں ۔

سیاسیات حاضرہ سے اقبال بہت مایوس ہیں ۔ یہ سیاست اس قسم کی ہے کہ غلاموں کی ڈوریوں کو اور مضبوط کرتی ہے ۔ ہنگامۂ جمہوری صرف ملوکیت کے چہرہ پر نقاب ہے ۔ اس کی فضا میں بال و پر پیدا نہیں ہو سکتے ۔ یہ سیاست کاری ایسی ہے کہ طائر قفس سے کہتی ہے ''اے درمند ، صیاد کے آشیان میں خانہ بند ہو جا'' ۔ ایسے سیاست کار کی گرمی گفتار سے الحذر ، اس کی لچھے دار باتوں سے الحذر جو بندہ مجبور کو اور مجبور بنانے والا ہے ۔ اس کے جام شراب سے الحذر ۔ اے مردِ آزاد اپنی خودی سے غافل نہ ہو اور فرعون کے سامنے حرف کلیم بلند کر یہاں تک کہ تیری ضرب سے دریا دو نیم ہو جائے ۔ کاروان اسلام کے بارے میں کہتے ہیں کہ ''اس کی رسوائی سے (دل) داغ داغ ہے اس کے قائد میں نور نہیں ہے ، وہ تن پرست ، جاہ مست اور کم نگاہ ہے ۔ اس کا اندرون لالہ سے بے نصیب ہے ۔ حرم میں قیام رکھتا ہے مگر کلیسا کا مرید ہے ۔ اس کا دامن پکڑنا ابلہی ہے ۔

جب تک مسلمانوں میں انقلابی روح پیدا نہیں ہوتی مسلم قیادت پر اقبال کا عمومی تبصرہ ہمیشہ درست رہے گا ۔ تن پرست ، جاہ مست اور کم نگاہ لوگ اس

امت کی زمام قیادت سنبھالتے رہیں گے ۔ کلیسا کی مریدی یا ''زنارِ فرنگی'' کلام اقبال میں بہت معنی خیز استعارے ہیں ۔ مریدان کلیسا سے وہ سب اہل اختیار مراد ہیں جو مغرب کے انسانیت کش استبدادی نظام کو ملت اسلام کی ہیئت اجتماعی پر ٹھونسنا چاہتے ہیں ۔ ان مریدان کلیسا نے زندگی کے ہرشعبہ میں ان ہی حالا ت کو پیدا کر دیا ہے جن سے مغرب کی فضا مسموم ہے اور انکا نظام مدنیت متزلزل ہے ۔ ''لاالہ'' کے نور سے خالی ہونے کی وجہ سے ہم نے وسیع پیمانے پر صنعتی ترقی ، سرمایہ کاری ، زرکاری ، اعتبار اندوزی ، مالیاتی منصوبہ ، بندی وغیرہ وغیرہ کی ان ہی تنظیمی اور اداراتی ساختوں کی اپنی ملی ہیئت میں وسیع پیمانہ پر پیوند کاری کی ہے جو خاص الخاص مغربی تمدن کی پیداوار ہیں اور ان کے بے نور استیصالی نظام کا جز ہیں ۔ یہ پورا نظام ابلیسانِ خاکی کی ایجاد و اختراع ہے ۔ اس کو وہ تجارت و سودا گری کا نام دیتے ہیں ۔ اقبال پوچھتے ہیں : ''اے رب یہ جادو ہے یا تجارت ؟'' ۔ ہم نے روح اسلام کے لحاظ سے تجربات نہیں کیے ۔ اقبال ایسی پوری قیادت کو ابلہی قیادت کہتے ہیں جو ہمہ طور اس ملت کا چہرہ بگڑنے پر لگی ہوئی ہے مگر حرم میں مقیم ہونے کی دعویدار ہے ۔ اس کی کم نگاہی اور سیاست بندِ غلامی کو اور مضبوط بنانے والی ، جمہورت کی آڑ میں ملوکیت کو مستحکم کرنے والی اور مرغ قفس کو اور اسیر کرنے والی ہے ۔ اس سے پیشیر اقبال یہ بتا چکے ہیں کہ وہ فقیہ جن کی پشت پر ماضی کا انبار ہے وہ بھی کم سواد ہیں کہ حلال و حرام کا فرق کرنے سے قاصر ہیں ، ان کے ضمیر میں شعور عدل کا فقدان ہے اور اس لیے وہ ''احسن تقویم'' کے تقاضوں سے عاری ہیں ۔ ان کی زیادہ تر میراث وہ تاویلات اور مسائل ہیں جن کے ذریعہ قرون وسطیٰ کے طاغوتی نظام ہائے جبر و قہر پر ، جن کے اعماق فرعونی میں افلاس و نامرادی کے سوا کچھ نہ تھا ، مذہب و شریعت کا ٹھپہ لگایا گیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ بقول اقبال (بندگی نامہ ، مذہب غلاماں) :

دین و دانش را غلام ارزان دہد تا بدن را زندہ دارد جان دہد
گرچہ برلب ہائے او نام خدا ست قبلۂ او طاقت فرمانرواست
طاقتے نامش دروغ با فروغ از بطونِ او نزاید جز دروغ
مذہبِ او تنگ چون آفاقِ او از عشا تاریک تر اشراق او

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے فقیہان طاغوت پرست انسانی خودی کے وجدان سے محروم تھے اسی لیے عظمت انسانی کا انھیں درک نہیں تھا ۔ ویسے اقبال کی بصیرت سے مزید یہ نکتہ بھی واضح ہوتا ہے کہ

محکوم ہے بیگانۂ اخلاص و مروت
ہر چند کہ منطق کی دلیلوں میں ہے چالاک

خود محکومیت ایک ایسا وجودی تجربہ ہے جو اس کے احوال و کوائف کو بدل دیتا ہے ۔ آدمیت کی رمق ، ہمدردی و مروت ، نازک خیالات اور لطیف جذبات سے پورا شعور خالی ہو جاتا ہے ۔ ان اعلیٰ عاطفوں سے رہنمائی حاصل کیے بغیر ہم کوئی مفید ادارہ سازی یا آئین بندی یا تصفیہ مسائل نہیں کر سکتے جو فلاح انسانی پر منتج ہوں ۔ اقبال وقت کی رفتار دیکھتے ہیں اور پیغام دیتے ہیں کہ (پیام مشرق ، نقش فرنگ) :

وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم
لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

اقوام مشرق کے تلاطم سے اقبال پر امید ہیں اور محسوس کرتے ہیں کہ :

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست
عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت
یوسفی را ز اسیری بہ عزیزی بردند
ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت
راز ہائے کہ نہان بود بہ بازار افتاد
آن سخن سازی و آن انجمن آرائی رفت

فرماتے ہیں کہ میں اس پرانی خاک میں حیات کا موتی دیکھ رہا ہوں ۔ ہر ذرے کی آنکھ تارے کی طرح روشن معلوم ہوتی ہے ۔ ہر وہ دانہ جو ابھی زمین میں پڑا ہے مجھے شاخ در شاخ گھنا اور تنومند پیڑ معلوم ہوتا ہے ۔ پہاڑوں کو پرکاہ کی طرح ہلتا ہوا محسوس کر رہا ہوں اور پرکاہ کو پہاڑوں کی طرح مضبوط ۔ وہ انقلاب جو افلاک میں بھی نہ سمائے دیکھ رہا ہوں گو کہ میں جانتا نہیں کہ کس طرح دیکھ رہا ہوں[1] ۔ اقبال کہتے ہیں کہ زندگی جوئے رواں ہے اور رواں ہی رہنا چاہتی ہے ۔ یہ پرانی شراب ہمیشہ جوان ہے اور جوان ہی رہنا چاہتی ہے ۔ جو کچھ ہے ، چاہتی ہے کہ گزر جائے اور جو موجود نہیں ہے اس کو موجود کرنا چاہتی ہے . . . مژدہ ہو کہ میری تاریک راتوں کی صبح نظر آنے لگی ہے ، شمع بجھ رہی ہے اور خورشید کا نشان دکھائی دینے لگا ہے ۔

جاوید نامہ میں ایک مقام ہے فلک مریخ کی سیر ، وہاں ان کا گزر ایک شہر سے ہوتا ہے ۔ اس کا نام ہے مرغدین ، وہ عجیب و غریب شہر ہے ۔ اس کا نظام زندگی ایسا ہے کہ حکیم مریخی اس کی بابت کہتا ہے کہ اس جگہ کوئی سائل و

۱۔ یہ تمام تفصیلات پیام مشرق میں نقش فرنگ (صفحہ ۲۲۵-۲۳۳) کے عنوان کے تحت درج ہیں ۔

محروم نہیں ہے ، عبد و مولا ، حاکم و محکوم نہیں ہے - یہ سن کر زندہ رود سے نہیں رہا جاتا - وہ کہتا ہے :

سائل و محروم تقدیر حق است حاکم و محکوم تقدیر حق است
جز خدا کس خالق تقدیر نیست چارۂ تقدیر از تدبیر نیست

حکیم مریخی اس کا جو جواب دیتا ہے سننے کے قابل ہے - اگر ایک تقدیر سے جگر خون ہو ، تو حق ہے دوسری تقدیر کا حکم چاہو - اگر تو نئی تقدیر چاہتا ہے تو یہ درست ہے اس لیے کہ تقدیرات حق لا انتہا ہیں - اہل ارض نے نقدِ خودی کو ضائع کر دیا ہے اور تقدیر کے اصل نکتہ کو فراموش کر دیا ہے - اس کے بحر میں ایک لطیف رمز پوشیدہ ہے - اگر تو بدل جائے تو تقدیر بھی بدل جاتی ہے - اگر تو خاک ہو تو ہوا کی نذر ہو جاتا ہے اور اگر سنگ ہوا تو شیشہ کو توڑ دیتا ہے - اگر تو شبنم ہے تو گراوٹ تیری تقدیر ہے اور اگر تو قلزم ہے تو بقا تیری تقدیر ہے -

اقبال یہاں ماہیت تقدیر کی عقدہ کشائی کرتے ہیں - وہ تقدیر کے وجود سے انکار نہیں کرتے - وہ صرف اس سے انکار کرتے ہیں کہ کائنات میں ایک ہی تقدیر ہے - حق یہ ہے کہ تقدیرات حق لا محدود ہیں - گویا انسان جیسا سماجی روحانی نظام اختیار کر لیتے ہیں اسی کے مطابق اُن کی تقدیر سازی ہونے لگتی ہے - اس کے جبر سے وہ نہیں نکل سکتے - یہ تقدیر انسانی کی عمرانی منطق ہے - اگر اصل دین یہ ہو کہ محتاج اور زیادہ محتاج بن جائے تو بقول حکیم مریخی اس دین خواب آور پر وائے ہے -

سحر و افسون است یا دین است این حب افیون است یا دین است این

اقبال حکیم مریخی کی زبان سے بہت باریک نکتہ کہلواتے ہیں : زندگانی دراصل جواہرات کی کان ہے جس کا تو امین ہے مگر مالک دوسرا ہے - مرد حق کے لیے طبع روشن آبرو ہے - یہ طبع روشن بتلاتی ہے کہ خدمت خلق مقصود خداوندی ہے - یہی رسم و راہ نبوت ہے ، جو اس خدمت کے عوض کا خواہش مند ہو وہ سوداگری کرتا ہے - یہ ہوا ، مٹی ، بادل ، کھیت ، باغ ، کوٹھی ، حویلی ، اینٹ اور پتھر وغیرہ کو اگر یوں جانے کہ مجھ سے ہے تو اے مرد نادان ! جان کہ یہ خداوند کی ملک ہیں - یہ حق کی زمین ہے اس کو اپنی زمین کہنا تو پھر آیت شریفہ ''زمین پر اصلاح کے بعد فساد مت پھیلاؤ'' (لاتفسدو فی الارض بعد اصلاہا) کی تفسیر کیا ہوگی ؟ مطلب یہ کہ ایسا کرنا یا یا کہنا اللہ کی زمین میں فساد پیدا کرنا ہے - ابن آدم اپنا دل ابلیسی نہاد بناتا ہے اور ابلیسیت میں سوائے فساد کے کچھ نہیں - جو شخص اس امانت کو اپنے

اغراض پر نہیں لگانا سو وہ خوش نہاد ہے ۔ اس نے امانت اس کے مالک کے سپرد کی مگر وہ بندہ جو آب و گل سے باہر نہیں جا سکتا ایسا ہے کہ جس نے اپنا شیشہ آپ توڑ لیا ۔

اقبال نے ان مقامات پر دراصل مقصود شریعت واضح کیا ہے اور وہ اساس فراہم کی ہے جس کی بنیاد پر فقہ کی تدوین جدید ہونی ہے تاکہ نظام اسلام زندگی کی حرکیت کا جز بن سکے ۔ اقبال کہتے ہیں کہ اسلام ایک عمرانی آئین ہے ، عقیدہ یا رویہ کا نام نہیں ۔ یہ ایک سماجی تجربہ ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اگر علماء اپنے ماضی کے علم کے ساتھ ساتھ درست طور پر ان مسائل کے مفہوم کو سمجھیں جن سیاسی اور معاشی مسائل سے آج اسلام دو چار ہے تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی . . . میں اپنی توجہ فقہ پر صرف کر رہا ہوں کہ علماء نے صدیوں سے اس کو نظر انداز کیا ہوا ہے ۔ اب قرآن مجید کا ایسی کتاب کی حیثیت سے مطالعہ کرنا چاہیے جو اقوام و ملل کے آغاز ، نشاۃ اور موت پر روشنی ڈالتی ہے ۔ تمام الہامی ادب میں قرآن غالباً پہلی کتاب ہے جو معاشرہ الناس کا تذکرہ 'زندہ نامیہ' کی طرح کرتی ہے ۔ قرآن باور کرتا ہے کہ معاشرۃ الناس مخصوص قوانین یا نوامیس کا پابند ہوتا ہے''[1] ۔ قرآن حکیم کے بارے میں اس قسم کا ذہنی انقلاب فقہ یعنی آئین و دستور و قانون کی تشکیل نو کا پیش خیمہ ہے ۔ اقبال اس تشکیل نو کے لیے اپنی ''تشکیل جدید الٰہیات'' کو محض ایک دیباچہ قرار دیتے ہیں ۔ اس میں انھوں نے اس مندرجہ ذیل تصور حیات کا فلسفہ بیان کیا ہے (زبور عجم) :

خدائے زندہ بے شوق سخن نیست — تجلی ہائے او بے انجمن نیست
الست از خلوت نازے کہ برخاست — بلٰی از پردۂ سازے کہ برخواست
اگر مائیم گردان جام ساقی است — بہ بزمش 'گرمی' ہنگامہ باقی است
مثال دانہ می کارم خودی را — برائے او نگہ دارم خودی را

ہمارے عہد میں قوموں کے اندرونی تلاطم بڑے معنی خیز ہیں ۔ اب دنیا تیزی سے اس حقیقت کی طرف آ رہی ہے کہ افزایش حیات اور استحکام خودی تمام صوری تنظیم اور عمرانی بافتوں کے اصول ناظمہ ہیں جو حیات اجتماعی کی توانائی اور تسلسل قائم و دائم رکھتے ہیں ۔ جب کہیں اور جہاں کہیں محرکات حیات میں زوال آ جاتا ہے اور ایسا نظام مسلط ہو جاتا ہے جو انفکاک خودی کا باعث ہو اور افراد کی شخصیتیں انشقاق کا شکار ہو جائیں تو پھر تمام حیات پرور عناصر رفتہ رفتہ فنا ہو جاتے ہیں اور حیات ملی کا تسلسل جس کو مرور ایام کے ساتھ ترقی پذیر رہنا

1. Letters and Writings of Iqbal, p. 61.

چاہیے دور اور تکرار کے ابتلا میں گرفتار ہو جاتا ہے ۔ تاریخ کا بہاؤ رک جاتا ہے ۔ سماجی تعامل کو مستمر کرنے والی شریانیں سخت ہو جاتی ہیں اور جسد اجتماعی سرد پڑ جاتا ہے ۔ پھر اس پر کرگس جمع ہو جاتے ہیں جو تن مردہ سے ماس نوچ کر جشن مناتے ہیں ۔

جو مفکر حیات ملی کو نباتی حیات پر قیاس کرتے ہیں ان کی ایک بڑی مثال اشپنگلر ہے ۔ موت کے بعد حیات کے وہ قائل نہیں ۔ چنانچہ ان کا خیال ہے کہ ہر تمدن موت کے بعد داستان پارینہ بن جاتا ہے ۔ یہ ایسی تقدیر ہے کہ پھر لوٹ کر آنے والی نہیں مگر اقبال دوسرے انداز کے مفکر ہیں ۔ وہ دوبارہ جی اٹھنے کے قائل ہیں ۔ خود کلام مجید میں جگہ جگہ ارشاد ہے کہ دوبارہ بھی حیات ہے ۔ موت کے بعد زندگی ہے اور اس امر کے ثبوت میں پہلی آفرینش کو پیش کیا گیا ہے ۔ خداوند نے زمین اور آسمان جس طرح پہلی مرتبہ بنائے اور جس نے سب کو ایک مرتبہ بنایا وہ دوسری مرتبہ بھی کر سکتا ہے ۔ حیات بعد ممات مسلم طرز فکر کا بنیادی عنصر ہے اس لیے کوئی مسلم مفکر جس کا قلب سلیم ہو اس سے لوٹ نہیں سکتا کہ تن مردہ میں بھی جان پڑ سکتی ہے اور جو کچھ دیر پہلے بے حس و حرکت تھا اپنے پیروں پر اٹھ کھڑا ہو سکتا ہے ۔ مسلم افکار میں یہ زمانہ کی منطق ہے جو اس کی مابعدالطبعی ہیئت کو لازم ہے ۔

بقول اقبال عالم اسلامی نے ۱۷۹۹ء کے بعد زندگی کی کروٹ لی ہے ۔ وہ لوگ جو اس کے دوبارہ جی اٹھنے پر یقین نہیں رکھتے اور جنہیں زمانے کی ساخت کا وجدان نہیں وہ یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ کاروان اسلام دوبارا اپنی زندگی کا آغاز کر سکے گا ۔ یا یہ کہ دوبارہ اس ثقافت کے قدم کار گاہ عالم میں نظر آئیں گے ۔ وہ خلوص سے افراد اسلام کو مشورہ دیتے تھے کہ وہ اس پرانے اور شکستہ جہاز کو چھوڑ دیں اور مغربی ثقافت کی پناہ میں چلے جائیں کہ یہ کشتی نوح ہے ۔ ان کے لباس ، وضع قطع ، آرٹ و ادب ، سماجی ریت ، کاروبار کے ادارے ، بھیس بہاؤ ، سرمایہ کاری کی تکنیک وغیرہ نیز مجلسی اداروں کو اختیار کر لیں ۔ ان اصحاب میں بہت سے مسلم قائدین بھی شامل ہیں ۔ ان میں سے بعض مصلحت جاریہ کے عنوان سے ان کے جواز کا فتوی دینے کے لیے آمادہ بھی رہتے ہیں مگر میں ان کا ذکر نہیں کروں گا ۔ میرے پیش نظر تو ٹائن بی Toynbee ہیں جو کہتے ہیں کہ اب کی دنیا آخری آرام گاہ (آماج گاہ) مغربی تمدن ہے ۔ یہ صاحب اسپنگلر کے مخالف کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں ۔ مگر زمانے کی اسی منطق پر ان کا دہرم ہے جو اسپنگلر نے پیش کی تھی ۔ اقبال کا زمانی وجدان اور ان کی عمرانی فکر ایسے تمام مشوروں کو باطل سمجھتی ہے ۔ وہ ثقافت اسلامیہ کے روشن و تاباں مستقبل کو روز روشن

کی طرح دیکھتے ہیں اس لیے جہاں تک ''جدیدیت'' کا مطلب مغربیت ہے وہ اسے مسترد کرتے ہیں اور جہاں تک جدیدیت کا مطلب ''نئے زندگی اور نئے تجربہ'' سے ہے تو اسے وہ اقوام مشرق اور عالم اسلامی کی تقدیر سمجھتے ہیں ۔ جو لوگ اس تجدد کے مخالف ہیں وہ تن مردہ کے پرستار ہیں ۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ ان خون آشام پرندوں کے ساتھی ہیں جن کا گزر بسر تن مردہ پر ہوتا ہے ۔ چنانچہ جب کوئی گدھ منڈلاتا ہے تو یہ نعرہ زن ہوتے ہیں کہ ''غیب سے کوئی مرد آیا ہے''۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو عالم اسلامی میں ہنگامہ حیات شروع ہے ۔ وہ دن دور نہیں جب مختلف طوفانوں اور نہنگ و اژدہا سے گزر کر تجربہ حیات کے طاقتور اور فعال اداروں کے قائم کرنے میں یہ کامیاب ہو جائے گا ۔ اس کی عقل تجربانی قیاس و اجماع کے ذریعہ اپنی صورت گری کرے گی اور نئے نئے عمرانی اختراعات کی موجد ہو گی ۔ اسی سے اس کے تار نفس کا تسلسل قائم ہو گا اور ترقی کے روشن افق اس کے سامنے ہوں گے ۔

تذکرۂ شعرائے کشمیر

مرتبہ : سید حسام‌الدین راشدی — بخش چہارم

تذکرہ شعرائے کشمیر کی آخری جلد جس میں ''ن'' سے ''ی'' تک کے شعراء کا تفصیلی تذکرہ موجود ہے ۔ ایک نایاب تحقیقی مجموعہ جو پاکستان میں اپنی قسم کی پہلی چیز ہے ۔

سائز : ۲۰ × ۸/۲۶ — صفحات : ۶۲۲

قیمت ۳۵۰۰ روپے

اقبال اکادمی ۔ کراچی